خوف کے آس پاس

(امیدِ زیست کے زیرِ عنوان کورونا کے تناظر میں تخلیق کی گئی منتخب شاعری)

ترتیب وتہذیب

ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد

اکادمی ادبیات پاکستان

خوف کے آس پاس

(امیدِ زیست کے زیرِ عنوان کورونا کے تناظر میں تخلیق کی گئی منتخب شاعری)

ترتیب و تہذیب

ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد

اکادمی ادبیات پاکستان

پطرس بخاری روڈ، سیکٹر ایچ۔ایٹ/ون، اسلام آباد

نگران اعلیٰ : ڈاکٹر یوسف خشک

ترتیب و تہذیب : ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد

طباعت : اختر رضا سلیمی

اشاعت : 2021

تعداد : 500

ناشر : اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/1، اسلام آباد۔

مطبع : نسٹ پریس، اسلام آباد

قیمت : -/300 روپے

ISBN: 978-969-472--501-7

Khauf k Aas Pas

Compiled by

Dr. Arshad Mehmood Nashad

Publisher

Pakisan Academy of Letters

Islamabad, Pakistan

انتساب

کووڈ 19 میں

جان کی بازی ہارنے والے

پاکستانی تخلیق کاروں

کے نام

Hasnain Sialvi

حسنِ ترتیب

بابِ نظم: لفظ وحشت کے جہانوں کی خبر دیتے ہیں

بابِ تراجم: چار اطراف میں پھیلی ہوئی حیرانی ہے

□□□□

حرفِ آغاز

آئینۂ تاریخ میں عیاں ہے کہ انسان نے قدرتی آفات کا ہمیشہ ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ زلزلے اور سیلاب وغیرہ جیسی ناگہانی آفات چوں کہ اچانک نازل ہوتی ہیں اور گزر جاتی ہیں اس لیے ان میں خوف کا عنصر کم ہوتا ہے لیکن وبائی امراض جو قدرتی آفات ہی کی ایک صورت ہیں، چوں کہ آہستہ آہستہ غیر محسوس طریقے سے ایک شخص سے دوسرے میں منتقل ہوتی ہیں اس لیے یہ اپنے ساتھ خوف بھی پھیلاتی ہیں لیکن یہ خوف کبھی انسان کو شکست نہیں دے سکا۔ مشہور ناول نگار گیبریل گارشیا مارکیز نے کیا خوب کہا تھا کہ وباؤں نے انسان کو پہلے سے زیادہ جینے پر اُکسایا۔

اگر تاریخ پر نظر دوڑائی جائے تو انسان مختلف ادوار میں وباؤں کا سامنا کرتا آیا ہے۔ معلوم انسانی تاریخ نے تقریباً 20 بدترین وباؤں کا سامنا کیا ہے۔ سب سے قدیم وبا کے آثار قبل از مسیح میں چائنا کے ایک گاؤں ہامن مانگھا کے آثاروں میں ملتے ہیں جس میں ہر گھر میں ہر عمر کے لوگوں کی باڈیز ملی ہیں۔ اس سلسلے میں آرکیالوجسٹ اور اینتھرو پالوجسٹ کا کہنا ہے کہ ان لوگوں کو شاید تدفین کا ٹائم بھی میسر نہیں آسکا۔

180-165 میں رومن ایمپائر میں طاعون کی وبا پھیلی جس میں 5 ملین لوگ اس کا شکار ہوئے۔ 1353-1346 چودھویں صدی عیسوی میں Black Death کی نام سے پلاگ کی وبا آئی۔ اس وبا نے یورپ میں تباہی مچادی اور 50 فی صد آبادی کو ختم کر دیا۔ یہ وبا ایشیا میں بھی پھیلی لیکن اس وبا نے یورپ کی تاریخ بدل دی۔

سولھویں صدی میں جو وبا آئی اس سے میکسکو اور سینٹرل امریکہ میں 15 ملین لوگ انتقال کر گئے۔ اس کے بعد امریکن پلیگ، اسپینش فلو، پولیو، ایڈز جیسی وباؤں نے دنیا کو متاثر کیا۔

گزشتہ برس دنیا کو اپنی لپیٹ میں لینے والے کرونا وائرس نے جہاں خوف اور دہشت کے سائے پھیلائے جس کو ہماری نسل نے آنکھوں سے دیکھا اور محسوس کیا۔ پوری دنیا میں ڈر اور

خوف نے انسانوں کو گھروں میں بند رہنے پر مجبور کر دیا۔ سرکاری و نجی دفاتر، تعلیمی ادارے، کارخانے، کاروبار حتیٰ کہ عبادت خانے تک بند ہو گئے۔ بازار کھلنے اور بند کرنے کے اوقات مقرر کیے گئے۔ اندرون و بیرونِ ملک پروازیں ملتوی کر دی گئیں اور دنیا بھر کے لوگوں کو گھروں میں رہنے کا پابند کر دیا گیا۔ اگر آزادی تھی تو صرف چرند اور پرند کو۔

اس صورت حال میں اکادمی ادبیات پاکستان کی ٹیم نے نہ صرف یہ کہ حوصلہ نہیں ہارا بلکہ اس خوف ناک صورت حال سے نکلنے کے لیے آن لائن ادبی نشستوں اور مشاعروں کا آغاز کیا، جو ادیبوں اور ادب سے وابستہ افراد کے لیے ہوا کا تازہ جھونکا ثابت ہوا۔ ان آن لائن نشستوں اور مشاعروں کا موضوع اور محور زیادہ تر موجودہ وبائی صورت حال ہی رہی۔ انھی دنوں اکادمی ادبیات پاکستان نے نوجوان شعرا کے لیے امیدِ زیست کے عنوان سے ایک ایوارڈ کا اعلان کیا۔ جس کے لیے ہمیں نہ صرف نوجوان بلکہ بہت سے سینیر شعرائے کرام کی تخلیقات بھی موصول ہوئیں جو اس بات کا ثبوت ہے کہ جہاں زندگی کے دیگر شعبوں کے افراد نے وبائی صورت حال سے نمٹنے کے لیے اقدامات اٹھائے وہیں ہمارے شاعروں اور ادیبوں نے بھی اس میں اپنا حصہ ڈالا اور اپنی تخلیقات کے ذریعے نوعِ انسانی کی رہنمائی کی اور ان کا حوصلہ بڑھایا۔

اکادمی کو موصول ہونے والی شاعری اکادمی کی ویب سائٹ پر اپ لوڈ کی جاتی رہی۔ بعد ازاں ہم نے معروف شاعر، محقق، نقاد اور استاد جناب ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد سے درخواست کی کہ وہ اس میں سے انتخاب کر کے ہمیں دیں تاکہ اسے کتابی صورت میں شائع کیا جا سکے۔ انھوں نے انتہائی محنت اور لگن سے یہ انتخاب مرتب کیا جس کے لیے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔

اس سلسلے کی پہلی کتاب کے صفحات چوں کہ محدود ہیں اس لیے بہت سے دوستوں کی نگارشات شامل ہونے سے رہ گئی ہوں گی۔ جنھیں اکادمی کی ویب سائٹ پر پڑھا جا سکتا ہے۔ بہت جلد دوسری کتاب بھی منظرِ عام پر لائی جائے گی۔ پہلے انتخاب میں کوشش کی گئی ہے کہ اردو کے علاوہ باقی زبانوں کی نمائندگی بھی ہو۔ سو ان زبانوں سے بھی منتخب تراجم شامل کتاب ہیں۔

امید ہے آپ کو اکادمی کی یہ کاوش پسند آئے گی۔ ہمیں آپ کی آرا کا انتظار رہے گا۔

(ڈاکٹر یوسف خشک پروفیسر میرٹوریس)

چیئرمین، اکادمی ادبیات پاکستان

کرونائی ادب: بے یقینی کے موسم میں یقین کا استعارہ

[۱]

ادب اور سماج بہ ظاہر دو الگ الگ وجود ہیں مگر دونوں ایک دوسرے کے ساتھ گہرے اور مستحکم رشتے میں بندھے ہوئے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو یقیناً غلط نہ ہوگا کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ادب کو عام طور پر معاشرے کا آئینہ اور تخلیق کار کو معاشرے کی آنکھ خیال کیا جاتا ہے کیوں کہ ادب کا بنیادی موضوع زندگی ہے اور معاشرہ زندگی کی آماج گاہ۔ تخلیق کار چوں کہ عام افرادِ معاشرہ سے زیادہ حساس، باریک بیں اور معاملہ فہم ہوتا ہے، اس لیے اس کی آنکھ اُن منظروں اور گوشوں کو بھی دیکھنے کی صلاحیت رکھتی ہے جو عام افرادِ معاشرہ کی رسائی سے باہر ہوتے ہیں۔ ادب زندگی اور زندگی کے مسائل سے سروکار رکھتا ہے، اس لیے سماج پر گہری نگاہ رکھنا ادیب اور تخلیق کار کی بنیادی ضرورت بھی ہے اور اس کی ذمہ داری بھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ سماج میں ہونے والی تبدیلیوں اور اتھل پتھل سے باخبری کے باعث وہ عام افراد کے برعکس سماجی تغیرات کے اثرات اور نتائج کو قبل از وقت بھانپ لیتا ہے اور ادب کے ذریعے ان کا موزوں و مؤثر اظہار کر کے افرادِ معاشرہ کی سمتِ راست میں رہنمائی کرتا ہے۔ ادب محض کسی سماج کی صورت گری یا اس کے مناظر کی عکس بندی کا فریضہ انجام نہیں دیتا بلکہ اس کو درپیش مسائل میں ثابت قدم رہنے، ان پر قابو پانے اور اس کی سمت و رفتار کو وزن و وقار عطا کرنے کا فریضہ بھی انجام دیتا ہے۔ عالمِ انساں کی تاریخ گواہ ہے کہ دنیا کے تمام خطوں میں سماج کی تعمیر و تشکیل اور حیات و بقا کے لیے مؤثر اور فعال کردار ادا کرنے والے اداروں میں ادب کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ ادب نے بلا شبہ شکوک و شبہات کی فضا اور بے یقینی کے موسموں میں دم توڑتی مخلوق کو امید اور رجائیت کا پیغام دے کر انھیں جادۂ حیات پر از سرِ نو سرگرمِ عمل ہونے کی تحریک دی ہے۔

حیاتِ انسانی ہمیشہ خطرات کی زد میں رہی ہے۔ زمین پر رہنے کے لیے انسان کو واقعی ہمہ وقت ناگہانی آفات و بلیات سے نبرد آزما رہنا پڑا۔ اس کا طویل سفر ایسے بے شمار حادثات اور واقعات سے بھرا پڑا ہے۔ کبھی سیلاب کے سبک خرام ریلے اس کے اسبابِ زیست کو بہا کر لے گئے تو کہیں قحط اور خشک سالی نے اُسے موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا کیے رکھا۔ کبھی وہ زمین کے غیض وغضب کا نشانہ بنا تو کبھی آسمان کے قہر کا ہدف۔ ارضی وسماوی بلاؤں کے ساتھ ساتھ متعدی اور خوف ناک وبائیں: طاعون، ہیضہ، ملیریا، چیچک، انفلوئنزا، اس پر یکے بعد دیگرے حملہ آور ہوتی رہیں اور اُن کے بے رحم پنجے پلک جھپکنے میں بستیوں کی بستیاں اُجاڑتے اور تباہ کرتے رہے۔ انسان بے بسی اور حیرت کی تصویر بنا ان خوف ناک اور وحشت خیز منظروں کا کرب سہنے پر مجبور رہا۔ ابتلاؤں کی اذیت اور مصائب وآلام کی چکی میں پستے پستے اس کی فطرت میں اذیت پسندی کا رنگ شامل ہونے لگا اور وہ امن وآشتی کے زمانوں میں بھی درد وآلام کی آرزو کرنے لگا۔ جنگ وجدال کی لہو رنگ داستانیں اس کی اسی آرزو کا نتیجہ ہیں۔ جلبِ مال وزر اور ہوسِ ملک گیری نے انسان کو انسان کے خلاف محاذ آرا کر دیا۔ قتل وغارت گری کا بازار گرم رہا اور انسانی جانیں وحشت و بربریت کا نشانہ بنتی رہیں۔

قدرتی آفات اور ناگہانی مصیبتیں ایک طرف مادی وسائل سے محروم کرنے اور جمے جمائے نظام کو تلپٹ کرنے کا باعث بنتی ہیں، جس سے اقتصادی بحران اور معاشرتی ابتری کو پھلنے پھولنے کا موقع مل جاتا ہے تو دوسری طرف انسانوں کی نفسیات اور رویوں پر بھی اس کے گہرے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ انسان خوف، نفرت، بے زاری، بے یقینی، بے حسی اور وحشت کا شکار ہو کر اپنے روحانی، تہذیبی، اخلاقی اور سماجی نظامِ اقدار سے دُور ہو جاتا ہے۔ زندگی کا خوف اُسے وجدانی سرشاری، روحانی کیف اور عرفانی فضا سے محروم کر دیتا ہے۔ یوں وہ ایقان کی گھنی چھاؤں سے محروم ہو کر شکوک وشبہات کے چھدرے سایوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ شکست وریخت کے ان موسموں میں سماج اور افراد کو شکستگی اور بکھراؤ سے بچانے کے لیے ادب ہمیشہ متحرک رہا ہے۔ ادبیاتِ عالم کی تاریخ پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے ہی یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ مختلف زمانوں اور مختلف منطقوں میں خلقِ خدا جن ابتلاؤں اور وباؤں کا نشانہ بنی ہے، اُن کی درد انگیز تصویریں ادب میں جا بجا اظہار کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ ناگہانی مصیبتیں اور بلائیں سماج سے اُس کا رنگِ زیست اور طرزِ حیات چھین کر اُسے جسمانی، ذہنی، روحانی، اخلاقی اور تہذیبی لحاظ سے بھی قلاش کر دیتی ہیں۔ شیخ سعدی نے دمشق کی قحط سالی کی جو خوف ناک تصویر

پیش کی ہے وہ انسان کی بے بسی اور بے چارگی کا نوحہ ہے۔ عشق جو انسانی جذبات میں سب سے طاقت ور اور توانا جذبہ ہے، وہ بھی ابتلا کی شدت میں انسانی حافظے سے مٹنے لگتا ہے :

چناں قحط سالی کہ اندر دمشق
کہ یاراں فراموش کردند عشق

جیفری چاسر نے کینٹربری ٹیلز (Canterbury Tales) میں خلق خدا کی اسی بے چارگی کو پیش کیا ہے۔ ۱۶۶۵ء میں ہنستا بستا لندن طاعون کی تباہ کاریوں کا ہدف بنا، اس کے دردناک منظر ڈینیل ڈیفو کے A Journal of the Plague Year کے ہر صفحے پر بکھرے ہوئے ہیں۔ اسی مہلک اور خوف ناک بیماری کی لہو رنگ تصویریں کامیو کے ناول The Plague میں اپنا اظہار کرتی ہیں۔ گارشیا مارکیز نے "وبا کے دنوں میں محبت" کے پردے میں انسان کی اسی بے بسی کو پیش کرنے کا جتن کیا ہے۔ اُردو ادب کے حوالے سے نظم و نثر کا دامن ابتلاؤں، وباؤں اور جنگ و جدال کے خونیں منظروں سے رنگا ہوا ہے۔ دلی کی تباہی اور بربادی کا آنکھوں دیکھا حال میر کے کلام میں جا بہ جا نمود کرتا اور آنکھوں کو نم ناک کرتا ہے۔ غالب نے جنگِ آزادی کے ہنگام کی لہو رنگ تصویریں کو خطوط کے قالب میں اس مہارت سے اُتارا کہ اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود بھی ان کا رنگ پھیکا نہیں پڑا۔ راجندر سنگھ بیدی نے سو سال پہلے اپنے ایک افسانے "قرنطینہ" میں ایسی ہی خوف ناک فضا پیش کی تھی، جس کا تجربہ ہم نے کووڈ 19 کے خوف آگیں ماحول میں کیا۔ وبائی اور ابتلائی صورتِ حال کی پیش کش کا حامل ادب بالعموم ہنگامی ہوتا ہے اور اس کے بیش تر مندرجات وقت کے ساتھ ساتھ فراموش ہوتے چلے جاتے ہیں، اُن کی شدت کم ہوتے ہوتے معدوم ہو جاتی ہے اور مابعد کے زمانوں میں اُس کی ادبی حیثیت تو کیا سماجی حیثیت بھی باقی نہیں رہتی۔ تاہم اس نوع کے ہنگامی ادب سے احساس کے بعض رنگ اور تجربے کی کچھ کیفیتیں ادب کے مستقل اثاثے میں اپنی جگہ بنا لینے میں کامیاب ہو جاتی ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُن کا معنویاتی دائرہ مزید کشادہ ہو جاتا ہے۔

[۲]

آج پورا عالم کرونا وائرس کی گرفت میں ہے۔ یہ وبا نومبر ۲۰۱۹ء میں چین کے شہر ووہان سے پھوٹی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اُس نے دوسرے ملکوں میں بھی اپنے خون آشام پنجے گاڑھنے

شروع کر دیے۔ مارچ ۲۰۲۰ء تک اس نے عالم گیر وبا کی شکل اختیار کر لی۔ اس وائرس نے اس قدر برق رفتاری اور سرعت کے ساتھ حملہ کیا کہ خلق خدا کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ اس کے پھیلاؤ کی شدت کے سامنے ساری تدبیریں اور حیلے ناکام ہو گئے اور ہنستے بستے گھر، بازار اور زندگی سے معمور بستیاں اور شہر پلک جھپکتے ہی ویرانی کا منظر پیش کرنے لگے۔ زندگی کا قافلہ تھم گیا۔ لوگ گھروں میں قید ہو کر رہ گئے اور جبری تنہائی اُن کی سزا مقرر ہوئی۔ حکومتوں اور انتظامی شعبوں نے اس کو روکنے اور اس کی شدت کو کم کرنے کے ہزارہا جتن کیے۔ کرفیو، تالا بندی، سماجی فاصلہ، سینی ٹائزر، ماسک، وینٹی لیٹر، آکسیجن اور قرنطینہ کے شور نے باقی آوازوں کو گم کر دیا۔ جدید ٹیکنالوجی اور سائنسی ترقی کا زعم جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ ایک چھوٹے سے وائرس نے انسان کے بڑے بڑے دعووں کی قلعی کھول دی اور اس پر اس کی بے حسی اور بے چارگی کو پوری طرح عیاں کر دیا۔ وباؤں اور ابتلاؤں سے انسانوں کا تعلق صدیوں سے ہے۔ خوف، وحشت اور ویرانی کے حیرت آگیں اور ساکت کر دینے والے لاتعداد منظروں سے اس کا رشتہ زمانوں پر محیط ہے۔ جنگ و جدال کے خون آشام مرقعے اس کے اجتماعی حافظے میں پورے رنگوں کے ساتھ قرنوں سے محفوظ اور موجود چلے آتے ہیں۔ کئی حوادث اور وباؤں میں موت کی شرح کووڈ 19 کی شرح سے بدرجہا زیادہ بھی رہی ہے مگر خوف، دہشت، سراسیمگی، بے بسی، کم مائیگی، قنوطیت اور یاسیت کا یہ رنگ پہلے کبھی انسانی معاشروں پر مسلط نہیں ہوا۔ اس کے متعدد اسباب ہو سکتے ہیں، جیسے: طاعون، ملیریا، چیچک، انفلوئنزا اور دوسری بیماری اگرچہ شدت کے ساتھ انسانی بستیوں پر حملہ آور ہوئیں اور پلک جھپکتے میں نظامِ حیات کو درہم برہم کر گئیں مگر ان کا ہدف ایک مخصوص علاقہ بنا اور کسی خاص جغرافیائی چار دیواری تک یہ محدود رہیں۔ ان بیماریوں کے حملے کا دورانیہ محدود اور کم وقت کے لیے تھا۔ دو چار دن یا زیادہ سے زیادہ ہفتہ عشرہ مگر ان کے برعکس کووڈ 19 کا پھیلاؤ کسی خاص علاقے یا ملک کی چار دیواری کے اندر مقید نہیں۔ پورے عالم پر اس کے منحوس سائے مسلط ہیں۔ اس کی شدت اور موجودگی کا دورانیہ کچھ مخصوص ایام تک محدود نہیں رہا بلکہ ہفتوں اور مہینوں سے بھی تجاوز کر کے برسوں پر پھیل گیا ہے۔ اس کی مختلف لہریں مختلف شکلوں اور رنگوں میں نئی آب و تاب کے ساتھ حملہ آور ہو کر سراسیمگی اور خوف کو بڑھاوا دے رہی ہیں۔ علاج معالجے اور ویکسی نیشن کے باوجود مکمل طور پر اس وبا پر قابو نہیں پایا جا سکا۔ ماہرین اور ڈاکٹروں کا ایک بڑا طبقہ اس خیال کا نقیب ہے کہ یہ وبا وقتی نہیں بلکہ پورے عالم کی مستقل مہمان ہے۔

کووڈ 19 کے آغاز اور تیز رفتار پھیلاؤ کے ساتھ پورے عالم میں اس کے اسباب وعوامل پر چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ دینی طبقوں نے اسے عذابِ الٰہی سے منسوب کیا اور انسانوں کی بداعمالیوں اور سیاہ کاریوں کا نتیجہ ٹھہرایا۔ بعض لوگوں نے اسے امریکہ کی سازش قرار دیا کہ امریکہ اس وقت اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے لیے یہ ہاتھکنڈ کررہا ہے، وہ اپنے آپ کو گلوبل ویلج کا طاقت ور ترین حکمران ثابت کرنے اور پورے عالم کو اپنا باج گزار بنانے کے لیے انھیں اقتصادی طور پر کمزور کرنے کا خواہاں ہے۔ یہ وبا قدرتی نہیں بلکہ امریکا کے ابلیسی ذہن کی پیداوار ہے۔ وہ اس کو پھیلا کر اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے۔ بعض گروہ اسے چین کی دفاعی حکمت عملی سے ملاتے ہیں۔ ایک بڑا طبقہ اسے اسٹریٹیجک اور ٹریڈ وار کا نقطۂ آغاز خیال کرتا ہے۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ ان گمراہ کن قیاس آرائیوں اور مفروضوں نے بھی خوف ودہشت کے اثر کو مہمیز کیا ہے۔

کووڈ 19 نے بلاشبہ حیاتِ انسانی کے رواں دواں نظام کو معطل کر کے رکھ دیا ہے۔ جدید ٹیکنالوجی نے انسانوں کو جس خوش فہمی اور ناقابلِ تسخیر ہونے کے زعم میں مبتلا کیا تھا، وہ ریت کی دیوار ثابت ہوا۔ یقین اور اعتماد کی فضا پر مایوسی اور بے یقینی کے سائے منڈلانے لگے۔ وبا کی سختی نے سارے عالم کو سماجی فاصلہ رکھنے پر مجبور کر کے اُسے مکمل طور پر تنہا کر دیا ہے۔ تنہائی ویسے تو تخلیقی عمل اور روحانی سرشاری کا اشاریہ ہے مگر کووڈ 19 کی اس جبری تنہائی نے پورے عالم کی نفسیات اور فرد کی سائیکی کو بڑی شدت سے متاثر کیا ہے۔ یہ جبری تنہائی روحانی سرخوشی اور روحانی سیرابی کا محرک نہیں بلکہ ذہنی پراگندگی اور جسمانی آزار کا باعث بنی ہے۔

وبا کے اس ہنگام میں مقامی شناختیں بڑی طرح متاثر ہوئی ہیں۔ عالم گیریت کا جن بے قابو ہو کر اقوامِ عالم کو ایک رسی میں باندھنے کی تدبیریں کرنے لگا ہے۔ علاقائی رسمیں، رواج، عادتیں، رویے، آدابِ معاشرت، طرزِ زیست اور مختلف خطوں کے امتیازی اور انفرادی رنگوں کا شعلہ بجھ گیا ہے۔ مسجدیں، مندر، گردوارے، چرچ، عبادت خانے، خانقاہیں، مدرسے، ادارے اور مختلف مذاہب کے مقدس مقامات کا تقدس مجروح ہوا ہے۔ ان سے جڑے ہوئے لوگوں کے مذہبی، اخلاقی، روحانی اور دینی تصورات میں دراڑیں پڑی ہیں۔ دیہاڑی دار مزدوروں سے لے کر بڑے بڑے سرمایہ داروں اور صنعت کاروں تک سب غم کی تصویر بنے ہوئے ہیں۔ تیسری دنیا ہی نہیں ترقی یافتہ اور طاقت ور ملکوں میں بھی خوف کا رقص جاری ہے۔

[۳]

پاکستان میں اگرچہ کرونا وائرس کی لہر اس شدت کے ساتھ حملہ آور نہیں ہوئی، جس شدت کے ساتھ اُس نے چین، جرمنی، امریکہ، بھارت اور کئی دوسرے ممالک پر حملہ کیا مگر خوف اور ہراس پاکستان میں ان ممالک کی نسبت زیادہ پھیلا اور ابتری اور بے رنگی کے مناظر زیادہ سرعت کے ساتھ سامنے آنے لگے۔ اس معاشرتی خوف نے شعر وادب کے حلقوں میں بھی ہل چل مچا دی۔ سوشل میڈیا کے پردوں اور اخبارات ورسائل کے صفحوں میں ابتلا کے یہ رنگ بکھرنے لگے۔ یاسیت، بے بسی اور قنوطیت کی اس فضا میں "امیدِ زیست" کا چراغ روشن کرنا ضروری تھا تاکہ بڑھتی ہوئی اس معاشرتی بے قراری کو سنبھالا دیا جاسکے۔ اُردو میں کووڈ 19 کے حوالے سے سال ڈیڑھ سال کے عرصے میں اچھا خاصا ادب تخلیق ہوا، جو ایک طرف تو عصری صورتِ حال کا اظہاریہ قرار دیا جاسکتا ہے اور دوسری طرف بے یقینی اور بے بسی کے موسموں کی تلخی اور شدت کو کم کرنے اور افرادِ معاشرہ کو اس خوف، دہشت اور ابتلا میں زندہ رکھنے کا حوصلہ فراہم کرتا ہے۔ کرونائی ادب کی ہنوز پوری طرح جمع آوری نہیں ہوئی تاہم اس کے کئی شعری اور نثری نمونے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ کا ناول "شہر خالی کوچہ خالی"، خاور چودھری کا اولین کرونائی افسانوی مجموعہ "طلسمِ کہن"، وبا کے تناظر میں محمود احمد قاضی کا افسانوی مجموعہ "کنواں"، آصف فرخی کا "تالابندی کا روزنامچہ" کے علاوہ کئی شعری اور نثری تخلیقات کتابوں اور رسالوں میں اشاعت پذیر ہوئیں۔ کرونائی عہد میں تخلیق ہونے والی شاعری نے سوشل اور پرنٹ میڈیا کے ذریعے عوام وخواص کے دلوں پر دستک دی۔ اس کے علاوہ ہنگامِ وبا میں بیسیوں کالم، فیچر، مضامین، تجزیے اور اداریے لکھے گئے، جن کے ذریعے کووڈ 19 کے مختلف سماجی اثرات پر اظہارِ خیال ہوا۔ ذنیازاد، ذوق اور کئی دوسرے رسائل نے "وبا نمبر" شائع کیے جن کے ذریعے اربابِ علم وفکر کے تجربات ومشاہدات کا رنگ سامنے آیا۔

اکادمی ادبیاتِ پاکستان کے چیئرمین پروفیسر ڈاکٹر یوسف خشک نے بھی اس ہنگامی صورتِ حال کے سحر کو توڑنے کے لیے کئی ہنگامی منصوبوں کا آغاز کیا تاکہ تخلیق کار اس بگڑتی صورتِ حال میں امید اور یقین کا چراغ روشن کرسکیں اور خلقِ خدا کو شکوک وشبہات سے نکال کر رجائیت سے بغل گیر کرنے میں کامیاب ہوں۔ انھوں نے تواتر وتسلسل کے ساتھ آن لائن ویب ناروں، کانفرنسوں اور ادبی تقریبات کا ڈول ڈالا۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے "امیدِ زیست" کا برقی پلیٹ فارم مہیا کیا کہ اُردو اور

دوسری پاکستانی زبانوں کے تخلیق کار اس کے ذریعے اپنے ہم وطنوں کو کرونائی صورتِ حال اور اس کے نتیجے میں پروان چڑھنے والی خوف کی فضا میں زندہ رہنے کا حوصلہ دے سکیں اور انھیں بے یقینی کے حصار سے نکال کر یقین کے کھلے ماحول میں لا سکیں۔ بہترین تخلیق پر انعام کی نوید بھی سنائی گئی تاکہ شعرا سنجیدگی سے اس طرف متوجہ ہو سکیں اور عصری صورتِ حال کو بہترین صورت میں پیش کرنے کی سعی کریں۔ ڈاکٹر خٹک صاحب کی اس پیش کش کا اُردو اور دوسری پاکستانی زبانوں کے شعرا نے والہانہ استقبال کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اُردو، انگریزی، پشتو، پنجابی، سندھی، سرائیکی، بلوچی، ہندکو اور دوسری پاکستانی زبانوں کی تخلیقات اس پلیٹ فارم کا حصہ بننے لگیں اور یوں مختصر عرصے میں کرونائی شاعری کا ایک بڑا ذخیرہ فراہم ہوا۔ انگریزی اور دوسری پاکستانی زبانوں کے شعرا سے یہ گزارش کی گئی تھی کہ وہ اپنی زبانوں میں لکھی گئی منظومات کا اُردو ترجمہ بھی کر دیں تاکہ ان کا تفہیمی دائرہ محدود منطقے سے نکل کر پاکستان کے وسیع و عریض حصے میں پھیل جائے۔ ''امیدِ زیست'' کے پلیٹ فارم پر پیش کیا گیا یہ کرونائی شعری ادب مختلف شعری اصناف اور مختلف ہیئتی پیکروں میں ہے۔ کئی شعرا نے اپنی ایک سے زائد تخلیقات پیش کی ہیں۔ معروف اور کہنہ مشق شعرا کے ساتھ ساتھ نو آموز اور تازہ کار شعرا نے بھی اس میں اپنا حصہ ڈالا ہے۔ سیکڑوں منظومات پر مشتمل اس سارے ذخیرے کی اشاعت چوں کہ ممکن نہ تھی، اس لیے انتخاب کا فیصلہ کیا گیا۔

میں پروفیسر ڈاکٹر محمد یوسف خٹک کا ممنون ہوں کہ انھوں نے یہ اہم ترین ذمہ داری مجھے سونپی۔ میں نے پوری دیانت داری اور محنت کے ساتھ اس جمع شدہ ذخیرے سے زیرِ نظر انتخاب کشید کرنے کی سعی کی ہے۔ انتخاب سراسر ذوقی معاملہ ہے، ممکن ہے کہ بعض طبائع اس انتخاب میں شامل بعض تخلیقات سے لذت گیر نہ ہو سکیں۔ ہر تخلیق کار کا صرف ایک شعری فن پارہ شاملِ انتخاب ہوا ہے تاہم ایک دو جگہ اس التزام کی پیروی نہیں کی گئی۔ بعض منتخب غزلیات اور نظموں سے ایسے اشعار یا مصرعوں کو نکال دیا گیا ہے، جن میں زبان و بیان یا وزن کے مسائل تھے۔ انتخاب چار فصلوں: مناجات، غزل، نظم اور تراجم پر مشتمل ہے۔

ہنگامی ادب کو بالعموم بڑا یا عظیم ادب خیال نہیں کیا جاتا۔ یہ بات بڑی حد تک درست ہے کیوں کہ ہنگامی ادب بالعموم تہ داری اور رمزیت کے ذائقے سے محروم ہوتا ہے۔ چوں کہ اس کے مخاطب عوام ہوتے ہیں اس لیے اس میں جذبے کی شدت راست اظہار کا تقاضا کرتی ہے۔ منظر نامے کی تبدیلی

کے ساتھ جذبے کی یہ شدت کم ہوتی جاتی ہے اور اس کا دائرۂ اثر گھٹتے گھٹتے معدوم ہو جاتا ہے۔ تاہم خوف و دہشت اور ویرانی و حیرانی کے موسموں میں لکھا ہوا ادب بعض ایسے نامیاتی اجزا کا حامل ہوتا ہے، جو ادب کی مستقل روایت میں اپنی جگہ بنانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ میرے خیال میں زیرِ نگاہ شعری انتخاب: ''خوف کے آس پاس'' میں شامل منظومات بھی ایسے نامیاتی عناصر سے محروم نہیں۔

ارشد محمود ناشاد

۱۱رجولائی ۲۰۲۱ء

سارے عالم پہ مسلط ہو گیا کیسا عذاب
یہ وبائے ناگہانی، یہ بلائے بے نقاب!!
خلق جس سے مر رہی ہے روز بے حد و حساب
موت کی دہشت سے پھیلا ہے جہاں میں اضطراب
ہر طرف آنسو ہیں ، نالے ہیں ، بکا ہے ، بَین ہے
اے خدائے مہرباں ! دُنیا بہت بے چین ہے

منزلیں گم ہو گئیں، معدوم ہے راہِ سفر
کارواں سب تھم گئے ، طائر ہوئے بے بال و پر
کتنی تدبیریں اکارت ، کتنے حیلے بے اثر
دندناتا پھر رہا ہے شہر کی سڑکوں پہ ڈر
اس مصیبت کی فضا سے دے زمانے کو نجات
فضل کر مخلوق پہ اپنی تو ربِ کائنات!

ہنستے بستے شہر ویراں ہو گئے یک بار سب
خوف سے سُونے پڑے ہیں کوچہ و بازار سب
ہے معطل نظمِ عالم ، بند کاروبار سب
عاجز و قاصر کھڑے ہیں عاقل و ہُشیار سب
موت کی دستک سے ہر پیر و جواں خطرے میں ہے
اے خدائے لم یزل! سارا جہاں خطرے میں ہے

اس وبا سے پورے عالم میں مچی ہے کھلبلی
ہے وجودِ مشرق و مغرب پہ طاری کپکپی
ہے ردائے خوف میں لپٹی ہوئی ہر زندگی
خیمہ زن ہے عرصۂ عالم میں محشر کی گھڑی
کردگارا! رحم کر ، مخلوق کی امداد کر
پنجۂ عفریت سے عالم کو اب آزاد کر

لرزہ بر اندام ہیں سارے جہاں کی بستیاں
التجا ہے صدقِ دل سے ، وارثِ کون و مکاں!
امتحاں کو ٹال دے اور دُور کر یہ سختیاں
الغیاث و الغیاث و الحفیظ و الامان
اے خدائے ابر و باراں! ایسی بارش بھیج دے
جو بہا کر میری دُنیا سے "کرونا" لے چلے

☆☆☆☆

آفتاب عالم قریشی

وحشتِ رنج و غم سے بچا اے خدا
ٹال دُنیا سے ہر اک بلا اے خدا
پھر یہاں گُلستاں چاہتوں کے کھلیں
پھر سبھی ایک دوجے سے ہنس کر ملیں
پھر چلے رحمتوں کی ہَوا اے خدا
ٹال دنیا سے ہر اک بلا اے خدا
جاری ہو جائے پھر سے طوافِ حرم
آدمیت پہ کر اپنا لُطف و کرم
اپنے بندوں سے مَت ہو خفا اے خدا
ٹال دُنیا سے ہر اک بلا اے خدا
موت کا رقص جاری ہے جو چار سُو
ختم کردے اسے اپنی رحمت سے تُو
ہر دُکھی دل کی ہے التجا اے خدا
ٹال دنیا سے ہر اک بلا اے خدا
زخم دل کے بھلا کس کو دِکھلائیں ہم
اپنی فریاد لے کر کہاں جائیں ہم
کون اپنا ہے تیرے سِوا اے خدا
ٹال دنیا سے ہر اک بلا اے خدا
☆☆☆☆

ڈاکٹر انیس الرحمن

تیرے در پہ آپڑے ہیں، یا الٰہیٰ رحم کر!
تجھ سے ہی سب مانگتے ہیں، یا الٰہیٰ رحم کر!

سب وباؤں، سب بلاؤں، آفتوں کو دور کر
رنج و غم گھیرے ہوئے ہیں، یا الٰہیٰ رحم کر!

تیری رحمت پہ نظر ہے، تیری قدرت پہ یقیں!
مٹتے ہی مٹتے ہیں، یا الٰہی رحم کر!

سارے سلطان و گدا، سب نیک و بد تیرے ہی ہیں
مغفرت سب چاہتے ہیں، یا الٰہی رحم کر!

سارے طوفان و حوادث ' سامنا جن کا رہا'
حکم سے تیرے ٹلے ہیں، یا الٰہی رحم کر!

تو ہی خالق، تو ہی مالک، تو، ہی ہے پروردگار،
مانتے تجھے ' مانتے ہیں، یا الٰہی ' رحم کر!

پھر سے لوٹا دے زمیں کو زندگی کی رونقیں،
سارے انساں کہہ رہے ہیں، یا الٰہی ' رحم کر!

☆☆☆☆

ڈاکٹر عزیز فیصل

لمحات سخت تال، مرے رب ذوالجلال
اس خوف سے نکال، مرے رب ذوالجلال

ابتر ہے، دل خراش ہے، ناگفتہ بہ ہے، اب
انسانیت کا حال، مرے رب ذوالجلال

خود کو خدا صفات جو کہتا تھا برملا
وہ بھی ہے اب نڈھال، مرے رب ذوالجلال

تو جانتا ہے خوب ، فقط تو ہی مالکا!!
کیا ہیں مرے ملال، مرے رب ذوالجلال

رستے ہیں بے نشان ، پریشاں ہیں شہر شہر
کر رونقیں بحال ، مرے رب ذوالجلال

ہر مبتلائے رنج کے چہرے پہ سکھ بکھیر
تجھ پہ ہے کیا محال ، مرے رب ذوالجلال

میری مدد کے جملہ وسائل ہوتے ہیں ختم
تو ہی مجھے سنبھال ، مرے رب ذوالجلال

☆☆☆☆

بشارت تشنہ

میرے معبودِ واحد مرے کبریا

میرے معبودِ واحد مرے کبریا
میرے مشکل کشا میرے حاجت روا
تُو اکیلا ہے واحد ہے یکتا ہے تُو
تیرا فرمان ہے لاتقنطوا
شاہِ ارض و سما میرے معبودِ مَن !
ہم مصیبت کے مارے ہیں بندے ترے
تیری تخلیق ہیں تیرا شہکار ہیں
ہم مصیبت میں ہیں
ہم پریشان ہیں
مانتے ہیں خدایا، گنہگار ہیں
ہم خطا کار ہیں
مالکا! بخش دے رحم فرما سزا سے بچا لے ہمیں
میرے معبودِ واحد سوالی ہیں ہم
ہاتھ اٹھائے ہوئے دل میں نادم ہیں ہم
رحم فرما ہمارے اکیلے خدا
تجھ کو تیری ہی رحمت کا ہے واسطہ

☆☆☆☆

ڈاکٹر محمد مشرف حسین انجم

"کرونا" وبا سے بچا میرے مولا
ہمیں رحمتوں میں بسا میرے مولا
سبھی آفتوں سے ہمیں دور رکھنا
یہی ہے لبوں پہ دعا میرے مولا
دلوں کو سکینت کی خوشبو سے بھر کر
نگاہوں میں راحت سجا میرے مولا
"کرونا" سے محفوظ ہو جائے خلقت
کرم کے مناظر دکھا میرے مولا
مٹا دے تو اس کی نحوست جہاں سے
فنا ہو یہ موذی بلا میرے مولا
تری ارض پہ تیرے مجبور بندے
ہیں تکلیف میں جا بجا میرے مولا
چمن میں نبیؐ کی محبت کے صدقے
گلاب شفا اب کھلا میرے مولا
خلائق ہے محصور اپنے گھروں میں
کرو ہر خطا سے رہا میرے مولا
خوشی میں بدل دے تو رنج و الم کو
ہے انجم کی یہ التجا میرے مولا

☆☆☆☆

شوکت محمود شوکت

ہر طرف خوف ہے ہر طرف کال ہے اک وبائے عجب سے، عجب حال ہے
زندگی کی ہوئیں ختم سب رونقیں بیس سو بیس کیا بد شگن سال ہے
قید گھر میں ہیں وہ ، جو کہ آزاد ہیں
محو گریہ ہیں سب ، محو فریاد ہیں

کوئی کہتا ہے محشر ہے نزدیک اب کوئی کہتا ہے ناراض ہے ہم سے رب
کوئی کہتا ہے ، طاغوت کی چال ہے کوئی کہتا ہے اعمالِ بد ہیں ، سبب
کچھ سمجھ میں نہ آئے ، یہ کیا بات ہے
عالم ہست ، جائے مکافات ہے

دوستی کے وہ قصے پرانے ہوئے کیا سے کیا عاشقی کے فسانے ہوئے
بھاگتا ہے یہاں بھائی بھائی سے اب بھائی چارے کو بیتے زمانے ہوئے
الاماں ! الاماں ! دور بے کلانگی
آدمی سے ہے بے زار اب آدمی

پوچھتا ہی نہیں کوئی "اچھے" کو اب جاں کے لالے پڑے "سیدھے سچے" کو اب
نفسی نفسی کا عالم ہے اب اوج پہ ماں پلاتی نہیں دودھ بچے کو اب
گرم جوشی سے احباب جو ملتے تھے
ہاتھ بھی وہ ملانے سے اب کے گئے

حیف! بدلا ہے یوں زندگی نے چلن شہر میں لاش دیکھی گئی بے کفن
سخت کیوں کر ہوا ہے حصارِ خزاں شور و غوغا بپا ہے چمن در چمن
بے یقینی کی ایسی فضا چھائی ہے
موت سے پہلے جیسے کہ موت آئی ہے

مسجدوں کے جو کھلتے تھے تالے، ہیں بند بند ہیں یہ کلیسا، شوالے ہیں بند
جو جہاں تھا وہیں کا وہیں رہ گیا آنے والے ہیں گم، جانے والے ہیں بند
منزلیں گم ہوئیں، قافلے گم ہوئے
فاصلے بڑھ گئے، رابطے گم ہوئے

میرے مولا! بجا، تجھ سے ہم دور ہیں غرقِ عصیاں میں مانا شرابور ہیں
رحم کر، ہم پہ مالک! بحقِ نبیؐ ہم تو عاجز ہیں، بے بس ہیں، مجبور ہیں
لمحہ بھر میں بدل دے یہ حالات اب
بارآور ہوں سب کی مُناجات اب
☆☆☆☆

قہر جو ہم پہ مسلط ہے خدا تُو ٹال دے
بستیاں ویران کرتی یہ وبا تُو ٹال دے

یا الٰہی ہم گنہگاروں کے بس میں کچھ نہیں
ہاتھ جوڑے کر رہے ہیں التجا، تُو ٹال دے

ہر طرف بجھنے لگے ہیں زندگانی کے چراغ
سرسراتی ، دندناتی اب ہَوا تُو ٹال دے

اس وبا کی ابتدا ہے میری ارضِ پاک پہ
اس سے پہلے وقت کر دے انتہا تو ٹال دے

میرے مولا اُن سے بڑھ کر کون ہے پیارا تجھے
تجھ کو تیرے مصطفیٰ ﷺ کا واسطہ تُو ٹال دے

اب گلے ملنا تو کیا ہم ہاتھ چھونے سے گئے
مار دے گی فاصلوں کی یہ سزا تُو ٹال دے

سرنگوں ارشد کھڑا ہے اشک آنکھوں میں لیے
دل کی دھک دھک کر رہی ہے بس دعا تُو ٹال دے

☆☆☆☆

کاشف عرفان

کچھ اس طرح سے لوٹی ہے منطق کی بھاری ڈھال
مٹی میں مل رہا ہے یہ انسانیت کا مال
ویران ہو گئے ہیں سبھی شہر خوش خصال
اب بے کمال ہیں وہ تھے جتنے بھی با کمال
توبہ قبول کر اے مرے رب ذوالجلال
اے رب ذوالجلال

پہلا قدم تھا چاند پہ ، مریخ کا سفر
تسخیر آسمان بنا تھا مرا ہنر
بندوں کی بے کسی پہ کہاں تھی مری نظر
تجھ کو بھلا دیا ہے یہی ہے مرا ملال
توبہ قبول کر اے مرے رب ذوالجلال
اے رب ذوالجلال

کشمیریوں کا خون بہا میرے سامنے
آگے نہیں بڑھا میں فلسطیں کو تھامنے
شام و یمن کو کیا دیا میرے کلام نے
برما کی رونقیں بھی نہ میں کر سکا بحال
توبہ قبول کر اے مرے رب ذوالجلال
اے رب ذوالجلال

طاقت کا زعم ، میری تباہی کا راستہ
سمجھا میں سود کو ہی کمائی کا راستہ
بھولا ہوا تھا اپنی بھلائی کا راستہ
اب اک وبا سے دیکھ مرا کیا ہوا ہے حال
توبہ قبول کر اے مرے رب ذوالجلال
اے رب ذوالجلال

تیرے بنائے سارے اصولوں کو روند کر
منزل کوئی نہیں ہے یہ بے راہ رو سفر
تاریکیوں میں گم ہوں نہیں ہے کہیں سحر
صیاد پھنس گیا جو بنایا تھا اس نے جال
توبہ قبول کر اے مرے رب ذوالجلال
اے رب ذوالجلال

کوئی نہیں ہے جس سے ملاؤں میں ہاتھ اب
اک خوفِ ناگہاں ہے مرے ساتھ ساتھ اب
ہم سے مسافروں کو ہے جنگل میں رات اب
سر پہ دھرا ہوا ہے گناہوں کا ایک تھال
توبہ قبول کر اے مرے رب ذوالجلال
اے رب ذوالجلال

☆☆☆☆

عبدالشکور آسی

رب کعبہ کرم ، رب کعبہ کرم
رب کعبہ کرم ، رب کعبہ کرم

کچھ بھروسہ نہیں اپنے اعمال پہ
بار عصیاں سے جھکنے لگا ہے یہ سر
ہم کہاں جائیں گے تو نہ مانا اگر
رب کعبہ کرم ، رب کعبہ کرم

ہم نے پرواہ نہ کی تیرے احکام کی
اور سمجھا نہیں مقصد زندگی
تیرے محبوب کے ہیں مگر امتی
رب کعبہ کرم ، رب کعبہ کرم

موت کے ڈر سے ہیں گھر میں محصور ہم
اور مساجد سے بھی ہو گئے دور ہم
اس سے پہلے نہ تھے اتنے مجبور ہم
رب کعبہ کرم ، رب کعبہ کرم

سخت مشکل میں ہیں غم کے مارے ہوئے
جن سے امید تھی وہ کنارے ہوئے
چارہ گر اور مسیحا بچارے ہوئے
رب کعبہ کرم ، رب کعبہ کرم

ٹال دے سر سے یہ آفت ناگہاں
اس سے محفوظ ہو جائے سارا جہاں
حکمتیں آدمی کی ہوئیں رائیگاں
رب کعبہ کرم ، رب کعبہ کرم

☆☆☆☆

جلیل عالی

بہ آہنگِ ہوا کیا کیا ، بہ نیرنگِ ہوس کیا کیا
زمیں پر پھیلتا جاتا ہے شر کا وائرس کیا کیا

کبھی یکجا خوشی سے آشنائی کی نہ ذو آئی
رہا ہے دوسروں کو ٹھیس پہنچانے سے مَس کیا کیا

ہر اک حد سے نکل جانے کی اندھی خواہشوں اندر
بنا بیٹھا خود اپنے واسطے انساں قفس کیا کیا

حد ناممکن و ممکن سے بالا مرضیوں والا
چلاتا ہے زمین و آسماں پر اپنا بس کیا کیا

خرد خیموں میں بھی رقصاں خبر پر چھائیاں اس کی
سفر میں ہیں اسی کی سمت مینار و کلس کیا کیا

زمانہ دیکھنے کی دُھن میں آئینہ نہیں دیکھا
اور اب اِس عمر میں آنے لگا خود پر ترس کیا کیا

کوئی رت بھی کہاں غم سے کبھی خالی مگر عالیؔ
اکٹھی آگئی ہیں آفتیں اب کے برس کیا کیا

☆☆☆☆

نسیم سحر

یوں تو کرتی ہے بور تنہائی
مانگتے ہیں ہم اور تنہائی

بڑھتا جاتا ہے اتنا سناٹا
جتنا کرتی ہے شور تنہائی

ہو گئے لوگ کس قدر تنہا!
دیکھتی ہے بغور تنہائی

پہلے رہتی تھیں رونقیں کتنی
اور اب چاروں اور تنہائی!

بولتا ہی نہیں کوئی گھر میں!
کرتی رہتی ہے شور تنہائی

کیا ہے تنہائی کا علاج یہی؟
اور تنہائی ، اور تنہائی؟

شہر میں اک بلا کے آتے ہی
ہو گیا سب کا طور، تنہائی

ایک زنجیر سب کے پاؤں میں
بن گئی ایسی ڈور تنہائی

بنتی جاتی ہے اب نسیم سحر
زندہ انساں کی گور تنہائی

☆☆☆☆

محمود شام

گھر کی دنیا میں گزرتے ہوئے دن
کتنی صدیوں میں بکھرتے ہوئے دن

کھڑکیاں کھولتی کمسن صبحیں
بالکونی میں سنورتے ہوئے دن

خواب زلفوں پہ سجائے راتیں
رنگ ہر خواب میں بھرتے ہوئے دن

آسماں صرف ہے آنگن جتنا
چھت پہ چپکے سے اترتے ہوئے دن

بند کمروں میں کھلی تنہائی
چونکتے، سوچتے، ڈرتے ہوئے دن

کسی انگڑائی سے رکتی سانسیں
یونہی بے وجہ ٹھہرتے ہوئے دن

شہر آلودگی سے پاک ہوئے
بھیگتے، دھلتے، نکھرتے ہوئے دن

☆☆☆☆

ڈاکٹر محمد فخرالحق نوری

تھکتے نہیں تھے ملنے سے جو صبح و شام لوگ
کرنے لگے گریز وہ بالالتزام لوگ
سوئے فلک اٹھی ہیں نگاہیں بھی ، ہاتھ بھی
یہ کیا ہوا کہ گریہ کناں ہیں تمام لوگ
کچھ امتیاز غالب و مغلوب میں نہیں
یکساں وبائے عام میں ہیں خاص و عام لوگ
یک رنگ کر دیا ہے کس عفریت نے انھیں؟
یہ شاد کام لوگ ہیں یا تشنہ کام لوگ؟
خواہش تو تھی کہ طائر کم پر ہوں بس شکار
چلی ہوا تو آ گئے خود زیرِ دام لوگ
آفت پڑی جو سر پہ تو یاد آ گیا خدا
دینے لگے اذانیں سرِ برج و بام لوگ
الحاد خو بھی خوف سے کرنے لگے رجوع
ہیں مائل رکوع و سجود و قیام لوگ
ہونٹوں پہ ہے دعا و مناجات کا وفور
پڑھتے ہیں حمد و نعت و درود و سلام لوگ
ردِ بلا کے سارے وظیفے ہیں بے اثر
پڑھتے ہیں کس زباں سے خدا کا کلام لوگ؟
اوڑھا ہے اک فریبِ تضرع ، بزعمِ خویش
یوں بھی نکالتے ہیں مشیت سے کام لوگ
پائندگی تو ہے عملِ خیر کا ثمر،
رکھتے نہیں ہیں یاد فقط نام وام لوگ

تم اپنے ساتھ فکرِ زر و مال بھی کرو
ہم مر گئے تو کیا ہے کہ ہم تو ہیں عام لوگ

لرزاں ہیں راہِ عشق پہ رکھتے ہوئے قدم
ڈرتے ہیں دیکھتے ہوئے اب حُسن تام لوگ

آتا نہیں ہے چڑ کے لگانے سے کوئی باز
دیتے نہیں زبان کو اپنی ، لگام لوگ

خیرات لے کر جان سے جائے سفید پوش
تشہیر کا یہ کرتے ہیں کیوں اہتمام لوگ

نوریؔ حیات و مرگ میں کچھ فاصلہ نہیں
قعرِ فنا سے دور ہیں بس ایک گام لوگ

☆☆☆☆

حسن عباس رضا

کتنی ہم لکھ پائے، کتنی بھول گئے
لاشیں گنتے گنتے ، گنتی بھول گئے

یاد نہیں کب خوابوں کی تدفین ہوئی
دن اور جہلم کیا ، ہم بری بھول گئے

شہرِ وفا میں پیار کا ایسا کال پڑا
اہلِ محبت رسمِ وفا ہی بھول گئے

جہاں پہ شام انگوٹی لے کر جاگتی تھی
اب وہ گلیاں اور وہ بستی بھول گئے

حسنؔ ، یہاں اک شہرِ نگاراں ہوتا تھا؟
کس نے اس کی مانگ اجاڑی بھول گئے

☆☆☆☆

کرنل (ر) سید مقبول حسین

آگ سی محوِ سفر چاروں طرف
بے قراری کے نگر چاروں طرف

پھر کوئی بستی اجڑنے کو ہے اب
اک قیامت سر بسر چاروں طرف

شہر میں جلتی سی بجھتی یہ بستیاں
خوف کے اندھے نگر چاروں طرف

دھیرے دھیرے رہ گئے گھٹ کر یہاں
موت نے پھیلائے پر چاروں طرف

سائے پہ سائے دھرے ہیں اور ہے
سرسراہٹ خوف ڈر چاروں طرف

☆☆☆☆

ڈاکٹر فاطمہ حسن

آرام سے اب گھر میں رہو ، ملنے نہ آؤ
جو بات ہے دوری سے کرو ، ملنے نہ آؤ

یہ دن تو فقط خود سے ملاقات کے دن ہیں
کچھ لکھتے رہو اور پڑھو ، ملنے نہ آؤ

مشکل ہے بہت وقت کے اس جبر کو سہنا
تقدیر میں لکھا ہے ، سہو ، ملنے نہ آؤ

کب فاصلے رشتوں میں بھلا ہوتے ہیں حائل
فرقت میں بھی تم میرے ہی ہو ملنے نہ آؤ

جس جگہ ہو جیسی بھی گزرتی ہے گزارو
اپنے لیے جینا ہے جیو ملنے نہ آؤ

جب گردش دوراں سے کبھی ہوگی رہائی
اس وقت نہ کہنا کہ کہو ملنے نہ آؤ

☆☆☆☆

ریاض احمد قادری

یہ کیسی رت ہے جب آب و ہوا سے خوف آتا ہے
بہاروں میں بھی گلشن کی فضا سے خوف آتا ہے

نگلتی جاتی ہے انسانیت کو جو قضا بن کر
بچا مولا ہمیں قاتل وبا سے خوف آتا ہے

یہ کیسا آگیا موسم سبھی سے دور رہنے کا
ہمیں ملنے ملانے کی ادا سے خوف آتا ہے

یہ کیسے خیمۂ تنہائی میں رکھے گئے ہیں ہم
جہاں بیمار کو ہر پل شفا سے خوف آتا ہے

کبھی آواز اپنی زندگانی کی علامت تھی
یہاں خاموش رہ رہ کر صدا سے خوف آتا ہے

جہاں پہ دور رہنا قُرب کا مصداق بن جائے
وہاں ہر ابتدا اور انتہا سے خوف آتا ہے

تضاداتِ زمانہ کی وبا یہ کیسی پھیلی ہے
ترے حرفِ تسلی سے ، دعا سے خوف آتا ہے

ریاضؔ احمد غذا کا قحط بھی سونے نہیں دیتا
جو کھانے کو میسر ہو ، غذا سے خوف آتا ہے

☆☆☆☆

اشرف جاوید

ہاتھ قاتل سے ملانے کی ضرورت کیا ہے
راستہ گھر کا دکھانے کی ضرورت کیا ہے
وہ تو خاطر میں نہیں لاتا مسیحا کو بھی
بات ظالم سے بڑھانے کی ضرورت کیا ہے
شہر سنسان ہوئے جائیں اسی کے ڈر سے
خوف کو روگ بنانے کی ضرورت کیا ہے
سانس لینے کے لیے تازہ ہوا بھی نہیں ہے
ایسے میں سیر کو جانے کی ضرورت کیا ہے
یہ مکافاتِ عمل ہے، یہ گناہوں کی سزا
جان کر آنکھیں چرانے کی ضرورت کیا ہے
ہے فقط گوشہ تنہائی، اگر غم کا علاج!
بے سبب بھیڑ میں آنے کی ضرورت کیا ہے
دونوں مخلوقِ خدا ہیں، وہ قضا ہو کہ شفا
یہ کھلا راز چھپانے کی ضرورت کیا ہے
اس کی چوکھٹ کو پکڑ لیں، اسے راضی کر لیں
سر کہیں اور جھکانے کی ضرورت کیا ہے

☆☆☆☆

کرنل (ر) ناصر نسیم

آنکھ میں خون بھرے یہ نہیں ہونے دینا
دل "کرونا" سے ڈرے یہ نہیں ہونے دینا
سینہ سینے سے پرے، ہاتھ پرے ہاتھ سے ہو
روح سے روح پرے یہ نہیں ہونے دینا
دیکھنا غربت و افلاس نہ مارے شب خوں
بھوک سے کوئی مَرے یہ نہیں ہونے دینا
سب کو تلقین ہے گھر میں ہی رہیں اور اگر
حد کوئی پار کرے یہ نہیں ہونے دینا
آزمائش ہے مرے چارہ گرو خیال رہے
کوئی گھٹ گھٹ کے مَرے یہ نہیں ہونے دینا
سوزنِ خار سے زخمی ہوں شگفتہ کلیاں
ظلم کوئی بھی کرے یہ نہیں ہونے دینا
اے محافظ، کوئی مجبور ہو ایسا کہ یہاں
پگڑی پاؤں میں دھرے یہ نہیں ہونے دینا
زیست کا زیست کی امید پہ ہے دارومدار
کوئی نومید کرے یہ نہیں ہونے دینا

☆☆☆☆

ڈاکٹر عمران ظفر

خوف و ہراس پھیلا ہے قرب و جوار میں
جب سے وبا یہ آئی ہے اپنے دیار میں

اک پل تو یوں لگا کہ کرونا مجھے بھی ہے
میں نے علامتیں جو پڑھیں اشتہار میں

کیسی ہے یہ وبا کہ کوئی پوچھتا نہیں
بیگانے ہو کے رہ گئے اپنے دیار میں

اب احتیاط کر مرے بھائی! کہ بعد میں
رہنا نہیں ہے کچھ بھی ترے اختیار میں

میں چھینکنے لگا تو کرونا کے خوف سے
غیروں نے بیٹھنے نہ دیا بزمِ یار میں

بازار بند، گھر میں پڑے، اہلیہ کے ساتھ
"قسمت میں قید لکھی تھی فصلِ بہار میں"

کتنا ہے بد نصیب ظفر دید کے لیے
دو ہفتے سے گزر نہ ہوا کوئے یار میں

☆☆☆☆

ڈاکٹر فرحت عباس

ہر ایک شخص بلائیں اٹھائے پھرتا ہے
طرح طرح کی وبائیں اٹھائے پھرتا ہے
یہ کیسا خوف ہے دنیا پہ آج چھایا ہوا
کفن فروش قبائیں اٹھائے پھرتا ہے
غریبِ شہر پہ رحمت خدا ہی فرمائے
دعا کو اپنی ردائیں اٹھائے پھرتا ہے
ہوائے دشتِ قضا سر بسر ہے عالم میں
ہجوم پھر بھی ردائیں اٹھائے پھرتا ہے
بس ایک درد کا مارا، زمین زادہ بھی
زمیں کی ساری بلائیں اٹھائے پھرتا ہے
فریفتہ ہے ہر اک پہ اگر ملے موقع
یہ وائرس تو ادائیں اٹھائے پھرتا ہے
حصارِ موج سے اُلجھا، نفس کا مارا ہوا
یقیناً اپنی خطائیں اٹھائے پھرتا ہے
اب اعتبارِ جہاں کب کسی کا ہو فرحتؔ
وفا شعار جفائیں اٹھائے پھرتا ہے
☆☆☆☆

میجر (ر) اعظم کمال

خنجر سی لگ رہی ہے شمشیر لگ رہی ہے
ہر سانس مجھ کو اب تو اِک تیر لگ رہی ہے
بکھری ہوئی ہے ہر سُو قاتل وبا کرونا
مجھ کو تو زندگانی نخچیر لگ رہی ہے
لکھی ہوئی ہے اب تک قرطاسِ خواب پہ جو
مجھ کو تو وہ بھی تیری تحریر لگ رہی ہے
سورج میں کیوں ہے کالک سورج کی ہر کرن میں
نفرت بدوش شب کی تاثیر لگ رہی ہے
ہر گھر ہی قید خانہ محسوس ہو رہا ہے
مجھ کو تو یہ وَبا بھی زنجیر لگ رہی ہے
روٹھی ہوئی خوشی اب شاید کہ مان جائے
دیوارِ غم پہ میری تصویر لگ رہی ہے
اُمید کی کرن اب یا رب کوئی دکھا دے
ساری زمین مجھ کو دلگیر لگ رہی ہے
یا رب معاف کر دے تجھ سے ہی مانگتا ہے
تیری رضا ہی اب تو اکسیر لگ رہی ہے

☆☆☆☆

ڈاکٹر ایوب ندیم

یا رب! ترے جہان میں ایسا کبھی ہوا نہیں
چہرے بھی ہیں چھپے ہوئے، در بھی کوئی کھلا نہیں

ٹھہرے ہوئے ہیں قافلے، سنساں پڑے ہیں راستے
غم کی شب سیاہ میں روشن کوئی دیا نہیں

شاخیں بھی زرد ہوگئیں، پتے بھی سارے جھڑ گئے
سہمے ہوئے طیور میں اُڑنے کا حوصلہ نہیں

آندھی کا زور ہے ابھی ، اک تہ جمی ہے گرد کی
ہوگی زمین صاف جب ، دیکھیں گے کیا ہے، کیا نہیں

جنت نہ تھی مرے لیے، اب تو نہیں زمین بھی
جاؤں کہاں مرے خدا ، کوئی ترے سوا نہیں

☆☆☆☆

سوگواری کی فضا لے کے چلی آئی ہے
یہ ہوا کیسی ہے بِکا لے کے چلی آئی ہے
موت بیٹھی تھی مچانوں پہ نشانے لے کر
موقع پاتے ہی وبا لے کے چلی آئی ہے
کتنے برسوں سے دکی بیٹھی تھی ہلچل کوئی
جو کیا اس کی سزا لے کے چلی آئی ہے
مجھ کو تو شہرِ خموشاں کا گماں ہونے لگا
جانے کس سمت ہوا لے کے چلی آئی ہے
رنج بھی اس کو ستاتا ہے ہری بیلوں کا
دکھ گلابوں کے صبا لے کے چلی آئی ہے
کوئی تو عرصہ محشر کی گھڑی سے پوچھے
کس لیے آہ و بکا لے کے چلی آئی ہے
تھا یقیں مل کے کھلیں گے گل ِتازہ لیکن
رت بچھڑنے کی ادا لے کے چلی آئی ہے
سر جھکائے ہوئے مولا! میں کھڑا ہوں در پہ
بے بسی حرفِ دعا لے کے چلی آئی ہے

☆☆☆☆

اختر عثمان

وہ مجلسِ شبانہ و افسانہ بند ہے
مدت سے کوئے نرگس و ریحانہ بند ہے

صحرا میں خاک اڑانے کو کوئی نہیں رہا
کوئے جنوں خموش ہے ویرانہ بند ہے

اب سوچتی کہ دکھ سے بجھتی ہے شمعِ شام
کب سے طواف و گردشِ پروانہ بند ہے

روتے ہیں کسمپرسی کی حالت میں قدح خوار
دروازے پہ لکھا ہے کہ مے خانہ بند ہے

آزادگی کی باس نجانے کہاں گئی
ہر فردِ شہرِ خواب کا اب خانہ بند ہے

ویران ہو گئے وہ شبینے وہ محفلیں
بزمِ سخن ہے بند خرد خانہ بند ہے

مدہوش و ہوش مند ہیں سب صرفِ میکدہ
اہلِ خرد کو چھوڑیے دیوانہ بند ہے

گھٹتا ہے میری روح قرنطینہ رہ گئی
خود میرے واسطے مرا کاشانہ بند ہے

وہ ہاؤ ہو نہیں ہے وہ زخمِ رفو نہیں
شورِ طبیب و شورشِ رندانہ بند ہے

آوارگیِ شب کا مزا بھی نہیں رہا
من جملہ حال یہ ہے کہ مستانہ بند ہے

اب تو ہمارے ساتھ کے پنچھی بھی اڑ گئے
دامِ وبا کھلا ہے مگر دانہ بند ہے

نے ہاتھ ہاتھ سے نہ گلے سے گلا ملے
اختر کسی بھی قسم کا یارانہ بند ہے

ناصر بشیر

ہمارے شہر کا موسم ہُوا کرونائی
ہجوم ڈھونڈنے نکلا ہُوا ہے تنہائی

وبا وہ پھیل گئی ہے کہ پھول مرنے لگے
کہاں سے زہر یہ بادِ صبا اٹھا لائی

وہ خود کو شاملِ اہلِ وفا سمجھنے لگے
ہُوئے ہیں جب سے مقید گھروں میں ہر جائی

عجیب رنگ دکھایا ، فلک کی گردش نے
عروج موت نے پایا ، حیات گہنائی

رقیب جیسا ہی کردار ہے کرونا کا
نہیں پسند اسے دو دلوں کی یک جائی

گلاب سوکھے ہوتے اور خار جوبن پہ
یہ کیسی اب کے خدا نے بہار دکھلائی

کسی سے ہاتھ ملائیں تو یہ کھلے ناصر
ہماری شہر میں کس کس سے ہے شناسائی

☆☆☆☆

افضل صفی

وبا کے ضابطے بڑھنے لگے ہیں
سماجی فاصلے بڑھنے لگے ہیں

ہمارے عکس بجھتے جا رہے ہیں
چنانچہ آئینے بڑھنے لگے ہیں

تحیر ہے اداسی ہے یہ کیا ہے
کہ ہر سو دائرے بڑھنے لگے ہیں

کرونا ہے کہ سازش ہے کسی کی
دلوں کے وسوسے بڑھنے لگے ہیں

خدائے عزوجل ہم پہ کرم کر
ہمارے مجمعے بڑھنے لگے ہیں

قدم تیزی سے پیچھے ہٹ رہے ہیں
صفی اب راستے بڑھنے لگے ہیں

☆☆☆☆

اشرف یوسفی

چشم و مژگان و رخِ یار سے لگ کر بیٹھیں
اہلِ دل جتنے ہیں دیوار سے لگ کر بیٹھیں

موت کرتی ہے طواف آج گلی کوچوں کا
ساری یادیں دلِ بیمار سے لگ کر بیٹھیں

زلف کچھ روز سمٹ کر رہے اس شانے تک
پھول سب ان لب و رخسار سے لگ کر بیٹھیں

چیختی پھرتی ہے اس دشت کی مسموم ہوا
سب پرندے تنِ اشجار سے لگ کر بیٹھیں

صبح ہونے میں ابھی دیر لگے گی شاید
مہ وشاں طاقِ شبِ تار سے لگ کر بیٹھیں

جانے کس پر ہو کرم کون بچے کس کے طفیل
آج مومن بھی کفار سے لگ کر بیٹھیں

نہیں پابند خطاؤں کی عطائیں اس کی
نیک جتنے ہیں گنہگار سے لگ کر بیٹھیں

آپ بھی بیٹھ رہیں یوسفی صاحب اک سمت
در سے یا روزنِ دیوار سے لگ کر بیٹھیں

☆☆☆☆

حمیدہ شاہین

کسی شے کی نہیں کوئی تلافی ، بس معافی
صدائے اشک و خوں ہے بس معافی، بس معافی

ہمی پہ بار عہد اولیں تھا بادشاہا
ہمی سے ہو گئی وعدہ خلافی، بس معافی

ہماری ہی شعوری غفلتیں مہلک ہوئی ہیں
بگاڑے خود یہ باد و آبِ شافی، بس معافی

جواز انتشار و سرکشی کچھ بھی نہیں ہے
دلائل اور حیلے ہیں اضافی، بس معافی

جسے احساسِ عصیاں ہی ادھیڑے جا رہا ہو
سزا کے طور پر اس کو ہے کافی، بس معافی

ارادی جہل کے موذی نتائج آرہے ہیں
بقایا عیب رہنے دے غلافی، بس معافی

ہمیں ڈر ہے ، ہماری بے بسی سمجھی نہ جائے
ترے قانونِ رحمت کے منافی، بس معافی

☆☆☆☆

شجاعت سحر جمالی

کب سے میرے کمرے میں زندگی مقفل ہے
خواب خواب منظر میں کیا سراب منظر میں
آب آب آنکھوں میں تشنگی مقفل ہے
اور اس سے بڑھ کے بھی کوئی سانحہ ہوگیا
آدمی کے ڈر سے اب آدمی مقفل ہے
میں سمے کی دھارا سے آگے بڑھ نہیں پایا
میرے دل کے گوشے میں اک گھڑی مقفل ہے
اب ترے تخیل کو اس لیے نہیں پرواز
اس وبال خانے میں آگہی مقفل ہے
پہلے ان کی زلفوں کے ہم اسیر رہتے تھے
اب تو ان کی زلفوں میں چاندنی مقفل ہے
تو طواف کعبہ کو اس لیے نہیں جاتا
تیرے دل کے مندر میں مورتی مقفل ہے
شہر میں وبا پھیلی اک سحر سزا پھیلی
جو جہاں پہ تھا آزاد وہ وہی مقفل ہے

☆☆☆☆

محمد خلیل الرحمٰن خلیل

اُمید زیست کا سورج ابھی ڈھلا تو نہیں
چہار سمت اندھیرا کہیں ہُوا تو نہیں

یہ دیپ خون سے اپنے جلائے جائیں گے
کہ قطرہ آخری اس جسم سے گرا تو نہیں

اسے عذاب نہ سمجھیں ، یہ آزمائش ہے
ہے لمحہ صبر کا ، مایوس ہونے کا تو نہیں

ہمیں تو عقل سے دشمن کے ساتھ لڑنا ہے
یہ وائرس ہے ، "کرونا" کوئی بلا تو نہیں

کہ "سیلف آئسو لیشن" میں جان بچتی ہے
یہ زندگی کا تقاضا بہت بڑا تو نہیں

کہ وقفے وقفے سے صابن سے ہاتھ دھونے میں
خیال اپنا بھی رکھنا کوئی بُرا تو نہیں

خلیلؔ مانگ مدد رب سے اس گرانی میں
کرم کرے گا کہ نائب سے وہ جدا تو نہیں

☆☆☆☆

شوکت کاٹھیا

اس پُرخطر محاذ سے لوٹیں گے ایک دن
ہم زندگی کی جنگ بھی جیتیں گے ایک دن

مٹ جائے گی وبا یہ کرونا کی ، آخرش
بادل کرم کے لوٹ کے برسیں گے ایک دن

پھر سے جمیں گی دیکھنا یاروں کی محفلیں
اس ملتی اعتکاف سے نکلیں گے ایک دن

شاید یہ امتحان ہے، انساں کی ذات کا
سو امتحانِ ذات سے نکلیں گے ایک دن

دن پھر بہارِ زیست کے آئیں گے لوٹ کر
ہم یہ خوشی کا وقت بھی دیکھیں گے ایک دن

سر سبز ہو گی مزرعِ علم و ہنر کبھی
بچے ہمارے تختیاں لکھیں گے ایک دن

پھر سے سجیں گے کھیل کے میدان دوستو!
جھنڈے اٹھا کے قافلے نکلیں گے ایک دن

اب لکھ رہے ہیں درد و الم، ہم اگر تو کیا
جذب و خوشی کے گیت بھی گائیں گے ایک دن

تھا کون پہلی صف میں تنہا کھڑا ہوا
جذبوں کی داستان بھی لکھیں گے ایک دن

سرکش وبا نے کس لیے عالم کو آ لیا
گرہیں یہ اس حجاب کی کھولیں گے ایک دن

لاچار کر دیا ہے، کرونا نے کس لیے؟
اس بے بسی کے بارے میں سوچیں گے ایک دن

شوکت خدا کے فضل و کرم کے سبب سے ہی
ہم بھی عذاب جان سے نکلیں گے ایک دن

☆☆☆☆

طارق چغتائی

میرے مولا مری دنیا کو سلامت رکھنا
اس مصیبت میں مکینوں پہ عنایت رکھنا

زندگی تلخ ہوئی جاتی ہے؛ تیرے ہوتے
خواب کی مثل ہوئی زیست کی حسرت رکھنا

ہم سدا تیری رضا پہ رہیں راضی مولا
ہم کو آتا نہیں ہونٹوں پہ شکایت رکھنا

تو سمجھتا ہے سبھی دل کی چھپی باتیں بھی
تیرے دربار میں کیا غم کی وضاحت رکھنا

بس یہی ایک گزارش ہے یہی ایک دعا
وقتِ آخر ہمیں پابندِ شریعت رکھنا

تیرے بندے ہیں اگرچہ ہیں گنہگار بہت
عزتوں والے ہماری سدا عزت رکھنا

ٹال دے گا وہ مصیبت کی گھڑی کو طارق
اس کا شیوہ ہے ہر اک حال میں رحمت رکھنا

☆☆☆☆

ابھی موسم نہیں بدلا، ابھی کچھ دن ٹھہر جاؤ
چمن پھر سے ہرا ہو گا، ابھی کچھ دن ٹھہر جاؤ
بہاریں پھر سے آئیں گی، پرندے چہچہائیں گے
کھلیں گے پھول بھی کیا کیا، ابھی کچھ دن ٹھہر جاؤ
انہی ویران گلیوں میں وہ رونق پھر بپا ہو گی
نگر ہو گا یہ پھر ویسا، ابھی کچھ دن ٹھہر جاؤ
دلوں سے دل ملیں گے پھر ملاقاتیں بہم ہوں گی
ہے بس کچھ دن کا سناٹا، ابھی کچھ دن ٹھہر جاؤ
کبھی سورج بھی نکلے گا اسی شب کی سیاہی سے
اٹھے گا رات کا پہرہ، ابھی کچھ دن ٹھہر جاؤ
ابھی ہے دھند کا منظر، دھواں پھیلا ہے آنکھوں میں
نظر آ جائے گا چہرہ، ابھی کچھ دن ٹھہر جاؤ
سنو! ہم دستِ ہمت سے اگر اک بند باندھیں تو
پلٹ سکتا ہے یہ دریا، ابھی کچھ دن ٹھہر جاؤ
یہی اجڑے ہوئے جبران گھر آباد بھی ہوں گے
بسے گی پھر سے یہ دنیا، ابھی کچھ دن ٹھہر جاؤ

☆☆☆☆

ڈاکٹر طارق ہاشمی

عجیب فتنۂ دہشت ، کمالِ سازشِ خوف
ہوئی ہے پھر کوئی تدبیرِ وہم و کاوشِ خوف

اکیلے صحن میں بیٹھا ہوا تماشائی
لگی ہوئی در و دیوار پہ نمائش خوف

کتابِ ہست میں کیفیت اور لکھی ہی نہیں
ہر اک ورق پہ رقم ہے فقط نگارشِ خوف

عجب طرح سے یہ اعصاب ڈر کے عادی ہوئے
ہماری آنکھوں میں رہنے لگی ہے خواہش خوف

حصار کھینچا گیا آسمان تک طارق
اور اس دیار میں جاری رہی ستائش خوف

☆☆☆☆

شوکت محمود شوکت

ایک شورِ ناگہانی ، میں قرنطینہ میں ہوں
ہے وبائے آسمانی ، میں قرنطینہ میں ہوں
شہر سونے ہو گئے ہیں ، رونقیں مفقود ہیں
منجمد ہے زندگانی ، میں قرنطینہ میں ہوں
ایک پل کو بھی نہیں جمتی بساطِ دوستاں
اب کہاں وہ "یار جانی" ، میں قرنطینہ میں ہوں
جس کو دیکھو ، ہے مقید ، اپنے اپنے غار میں
ہو گئی دنیا پرانی ، میں قرنطینہ میں ہوں
آ گیا سب کی سمجھ میں "کُلُّ نَفسٍ ذائقۃ"
بالیقیں ہر شے ہے فانی ، میں قرنطینہ میں ہوں
ایک مشتِ خاک کی وقعت یہی ، وہ خاک ہے
کیا بڑھاپا کیا جوانی ، میں قرنطینہ میں ہوں
ہے عبث ، جو گلستاں میں ، ان دنوں ہے اوج پہ
فصلِ گل کی راج دھانی ، میں قرنطینہ میں ہوں
ختم ہونے کو ہے شوکتؔ ! داستانِ کُل جہاں
پھر نئی ہو گی کہانی ، میں قرنطینہ میں ہو

☆☆☆☆

محمد علی منظر

مصروف ہوں گے سارے ہی بیکار ایک دن
سیر چمن کو جائیں گے سب یار ایک دن

انسان کے کمال سے چمکے گا یہ جہاں
مٹ جائیں گے زمین سے آزار ایک دن

چہکار سے پرند کی گونجے گا گلستاں
اچھی خبر سنائیں گے اخبار ایک دن

ٹوٹے گا جب طلسم تو بیدار ہوں گے لوگ
بھر جائیں گے یہ کوچہ بازار ایک دن

خالی گلی ہے دور تک اک بھی نفس نہیں
ملنے ضرور آئیں گے سب یار ایک دن

اب تو خزاں کا راج ہے باد سموم ہے
پھولوں سے بھر ہی جائیں گے اشجار ایک دن

☆☆☆☆

جنید آزر

خوف میں ڈوبے ہوئے، سایوں سے ڈرنے والے
دل بڑا رکھا کہ یہ دن بھی ہیں گزرنے والے

آزمائش کے شب و روز رہیں گے کب تک
کچھ زیادہ نہیں موسم یہ ٹھہرنے والے

فاصلے ہو ہی نہیں سکتے دلوں میں حائل
دوریوں سے نہیں ہم لوگ بکھرنے والے

وقت کا کام گزرنا ہے گزر جائے گا
ہمیں تو کرنے ہیں جو کام ہیں کرنے والے

زندگی تُو کبھی تنہائی میں ملنا آ کر
تیری تصویر میں کچھ رنگ ہیں بھرنے والے

ہر بلا تیری ہی رحمت سے ٹلی ہے اب تک
میرے سینے میں نئی خواہشیں بھرنے والے

☆☆☆☆

شہاب صفدر

نادیدہ اک بلا ہے مری چشم حال میں
میں بن گیا مریض مرض کے خیال میں

ہونی بچھائے بیٹھی ہے ہر سمت ایک جال
سانسوں کا دھیان، آئیں نہ ہونی کے جال میں

پوشیدہ سب نظیم بھی اپنی نظر میں ہوں
مضمر ہے راز فتح کا ایک اس کمال میں

صد احتیاط ہے دل و ایماں کا امتحاں
پھرتا ہے سامری کوئی شہر جمال میں

کرنا نہیں ہے صرف کف ِ غیر سے گریز
ظاہر نشان ِ ہجر ہے عارض کے خال میں

مانا ہمیشہ رہتی نہیں ابتلا کی رت
غفلت تو مستزاد ہے دور وبال میں

تلوار استعارہ ہے صولت کا گر شہاب
اظہار حفظ ِ جاں کا زرہ میں ہے ڈھال میں

☆☆☆☆

ڈاکٹر محمد اشرف کمال

ملو ضرور مگر ہم سے فاصلہ رکھنا
کہ دور ہی سے محبت میں رابطہ رکھنا

ہجومِ شہر سے خود کو علاحدہ رکھنا
کہ ہر طرف سے خود اپنا محاصرہ رکھنا

خود اپنی ذات کے محبس میں بیٹھ کر تنہا
خیالِ یار سے دن بھر مکالمہ رکھنا

دوا سے کام نکلتا اگر نہ ہو ممکن
لبوں پہ حرف کوئی صورتِ دعا رکھنا

وبا کے دور میں ہمت سے کام لینا ہے
کہ امتحان ہو جیسا بھی حوصلہ رکھنا

جو تنگدست ہیں ان کی مدد ضروری ہے
کہ بے کسوں کے لیے اپنا دل کھلا رکھنا

ہر ایک شہر میں لوگوں کی خیر ہو یارب
ہر ایک شاخ پہ محفوظ گھونسلا رکھنا

☆☆☆☆

عابد حسن

محشر سا بپا ہے کہ فضا پھوٹ پڑی ہے
اس شہر میں یہ کیسی وبا پھوٹ پڑی ہے

بے چارگیٔ دستِ طلب کا یہ اثر ہے
آنسو تو نہیں چشم انا پھوٹ پڑی ہے

دل کی ہی سنے وہ نہ اثر اس پہ سخن کا
اشکوں سے مگر دل کی دعا پھوٹ پڑی ہے

یہ صبحِ فسردہ میں مجھے کس نے پکارا
بے نور اجالے میں ضیا پھوٹ پڑی ہے

کس کس پہ حسن کیجے یہاں گریہ و زاری
ہر گام پہ دل گیر صدا پھوٹ پڑی ہے

☆☆☆☆

محمد مختار علی

چراغِ رہگزر، اندر سے ہم کتنے اکیلے ہیں !!
کسی کو کیا خبر اندر سے ہم کتنے اکیلے ہیں

ذرا سا شور بھی دل کے لئے بارِ سماعت ہے !!
سکوتِ بام و در اندر سے ہم کتنے اکیلے ہیں

کوئی دکھتا نہیں ، سُنتا نہیں رودادِ تنہائی
بہ مثلِ رہگزر اندر سے ہم کتنے اکیلے ہیں

بظاہر کٹ رہا ہے وقت ہنستے کھیلتے اپنا !
عزیزانِ سفر اندر سے ہم کتنے اکیلے ہیں

سجا لیتے ہیں بزمِ دوستاں حیلوں بہانوں سے
حقیقت میں مگر اندر سے ہم کتنے اکیلے ہیں

میسر ہیں چراغ و انجم و مہتاب و آئینہ
بھری محفل ہے پر اندر سے ہم کتنے اکیلے ہیں

جمالِ یار سے رونق سہی مختارؔ منظر میں
پر اے جانِ جگر اندر سے ہم کتنے اکیلے ہیں

☆☆☆☆

ہے عجب گردشِ حالات، خدا خیر کرے
اب وہ پہلی سی نہیں بات، خدا خیر کرے
کتنے بدلے ہوئے لگتے ہیں مرے شہر کے لوگ
چہرے چہرے پہ ہیں صدمات، خدا خیر کرے
اب کوئی ہاتھ ملاتا ہے تو خوف آتا ہے
کیسے ان دیکھے ہیں خدشات؟ خدا خیر کرے
موسمِ گل میں چلے گی جو کبھی بادِ سموم
پھر نہ گل ہوں گے نہ باغات، خدا خیر کرے
بیٹھکیں بند ہیں ہر بزم میں سناٹا ہے
جذبِ باہم ، نہ ملاقات، خدا خیر کرے
موت کے خوف سے چھوٹا ہے خدا کا گھر بھی
اب نہ سجدے نہ عبادات، خدا خیر کرے
روز ملنے کی نہ صورت ہے نہ آثار کوئی
پہلے حیلوں کی تھی بہتات، خدا خیر کرے
چلتا رہتا تھا کبھی خواب میں ہنگامِ زماں
جانے کب لوٹے گی وہ رات، خدا خیر کرے
جو تُو کہتا ہے وہ کر کے بھی دکھا دنیا کو
جبر کی توڑ روایات ، خدا خیر کرے

☆☆☆☆

عمانوئیل نذیر مانی

جب سے کیے کرونا نے سپنے مرے اُداس
کوچے مرے اُداس ہیں رستے مرے اُداس

دھرتا نہیں ہے کان کوئی اپنا خیر خواہ
آنکھیں مری اُداس ہیں نوحے مرے اُداس

ہر شخص میرے شہر کا تصویرِ غم بنا
لہجہ مرا اُداس ہے قصّے مرے اُداس

کیسا سفر پڑا ہے یہ میری حیات میں
آنکھیں مری اُداس ہیں لمحے مرے اُداس

کس نے چرائی ہے مرے چہرے کی روشنی
کس لئے کہتے ہیں اب یہاں نغمے مرے اُداس

سوچیں مری اُداس ہیں چہرہ مرا اُداس
دیوار و در اُداس ہیں رستے مرے اُداس

جب سے گیا ہے چھوڑ کے مانی وہ دلرُبا
چاہت مری اُداس ہے جذبے مرے اداس

☆☆☆☆

نعیم رضا بھٹی

جو نہ ہوتا تھا کام ہو گیا ہے
ہاں مرا انہدام ہو گیا ہے

یہ خبر اڑ رہی ہے چاروں طرف
موت کا انتظام ہو گیا ہے

نظر انداز کرنے والوں سے
رابطہ ہی تمام ہو گیا ہے

خود ہی زنجیر ہو رہے ہیں ہم
کیونکہ آقا غلام ہو گیا ہے

اب قدم اٹھ نہیں سکیں گے رضا
وقت جو بے نیام ہو گیا ہے

☆☆☆☆

دبیر عباس

اک مصیبت آسمانی اور ہم
خشک اشکوں کی روانی اور ہم

کیا سنائیں حال اپنا ، دوستو
دور پھر ہے امتحانی اور ہم

دیکھنے کی حد تلک تو ٹھیک ہیں
یہ بظاہر صاف پانی اور ہم

نوجوانی سے بڑھاپا آگیا
نامکمل ہے کہانی اور ہم

ساتھ اپنے سب یہاں رہ جائیں گے
موت ہو گی ناگہانی اور ہم

اختراکات مقدر پہ بھم
رو رہے ہیں رائیگانی اور ہم

☆☆☆☆

شمسہ نورین

نئی شیرازہ بندی ہے نئے منظر کا نقشہ ہے
مگر اس خوف کے پیچھے نئے انساں کا چہرہ ہے

بہت ہی تیز-رفتاری سے چلتے تھے سبھی راہی
اشارہ اک ہوا ایسا کہ جیون آن ٹھہرا ہے

کسی موہوم جرثومے نے سکھلایا سبق سب کو
وہی ہے قادر مطلق وہی طاقت کا چشمہ ہے

یہ سب مسدود ہوتے راستے اعلان کرتے ہیں
ہمارے پاس شاید اب فقط توبہ کا رستہ ہے

سراب زندگی ہم سے لپٹ کر آج کہتا ہے
یہ دنیا آزمائش ہے یہ دنیا ایک دھوکہ ہے

☆☆☆☆

محمد علی ایاز

اب شہرِ مہرباں میں نہ کوئی دکھائی دے
دھڑکن ہر ایک دل کی اگرچہ سنائی دے

کوئی مرض بھی ایسا نہ اس کو وبائی دے
مولا ترے حضور ہر انساں دہائی دے

اس خوف کی فضا سے خدا سب کو دے نجات
چہرہ ہر ایک شخص کا کھلتا دکھائی دے

جاری ہے رقص شہر کی گلیوں میں موت کا
ہر شخص گھر میں قید ہے، مولا رہائی دے

ہر سمت کائنات کا منظر اداس ہے
خاموش ہر زبان کو نغمہ سرائی دے

اپنے حضور میری دعاؤں کو اے خدا
شرفِ قبولیت کی گھڑی تک رسائی دے

☆☆☆☆

فیصل ریحان

ہر دل میں ہر نظر میں ٹھکانہ ہے خوف کا
دنیا ہے مضطرب کہ زمانہ ہے خوف کا

یکلخت کل جہان کی رونق ہوئی ہے ماند
ہر شہر ہر دیار نشانہ ہے خوف کا

اوراقِ زندگی پہ جہاں کیجیے نگاہ
اک داستان ِ غم ہے ، فسانہ ہے خوف کا

سب کے لبوں پہ ذکر ِ کرونا ہے ان دنوں
عالم تمام آئنہ خانہ ہے خوف کا
☆☆☆☆

وسیم عباس

ہر شخص ہے سہما ہوا آفات کے ڈر سے
جاں جیسے نکلتی ہے ، نکلتے ہوئے گھر سے

ہر سمت نظر آتے ہیں ویرانی کے منظر
مفلوج ہوئی زیست کرونا کے اثر سے

مسجد ہو کہ مندر ، وہ کلیسا ہو کہ معبد
آئے نہ صدا کوئی اِدھر سے نہ اُدھر سے

اب صبح طلب کی نہ شبِ وصل کی خواہش
بیگانہ ہوئی خلقِ خدا شام و سحر سے

اب کوئی عزیزوں سے گلے مل نہیں سکتا
لوٹے ہوں وہ چاہے کسی صحرا کے سفر سے

لے سکتا نہیں اُس کا بھی اب پیار سے بوسہ
ملتا تھا سکوں درد میں جس نورِ نظر سے

اب ہم سے جنازوں میں بھی شرکت نہیں ہوتی
اب راہ نہیں ملتی کسی راہ گزر سے

☆☆☆☆

شمسہ نجم

ہار جائیں ہمتیں کیوں، حوصلوں کی فکر کر
زندگی سے دور جاتے راستوں کی فکر کر

کام آ تو دوسروں کے، دیکھ اپنے اردگرد
روزی روٹی کو ترستے بے کسوں کی فکر کر

اب ملانا ہاتھ مشکل اور گلے ملنا محال
ان دنوں جو بڑھ گئے ان فاصلوں کی فکر کر

ایسی ان ہونی ہوئی اب چل پڑی باد سموم
فکر کر تو اپنے رشتوں، چاہتوں کی فکر کر

اس بری ظالم گھڑی میں دوستی کی کر سبیل
جو دلوں کو جوڑ دیں کچھ واسطوں کی فکر کر

☆☆☆☆

شگفتہ شفیق

ہنستی بستی سی بستیاں خاموش
کیا کہوں کیوں ہیں مہرباں خاموش

اس کرونا نے کر دیا ہے تباہ
در پہ تالہ ہے کھڑکیاں خاموش

اب تو کچھ بھی کلام کرتی نہیں
بولتی آنکھ چپ ، زباں خاموش

پھول اب بھی مہکتے رہتے ہیں
ملنے آتی ہیں تتلیاں خاموش

حال اپنا تمہیں سنائیں کیا
اب تو لگتے ہیں داستاں خاموش

قہقہوں کا جہاں بسیرا تھا
ہو چلا اب وہ آشیاں خاموش

اب شگفتہ کسے سنائیں غم
ہو گیا میرا راز داں خاموش

☆☆☆☆

اعجاز احمد

دریائے فکر و فن میں روانی تمام شد
یعنی خیال و حرف کے معنی تمام شد

رکھنا ہے اب تو، یار، پرندوں سے فاصلہ
پیڑوں سے دوستی بھی پرانی تمام شد

صبحِ طرب بھی آخری سانسوں پہ آ گئی
خوشبو بھری یہ شام سہانی تمام شد

آنسو نہیں چھلکتے کسی بات پر مرے
شاید فراتِ چشم کا پانی تمام شد

سوچیں، تخیلات سبھی خواب ہو گئے
خوابوں میں ڈھلتی رات کی رانی تمام شد

ہو جائے گی زبان پہ آنے سے پیشتر
اعجازؔ، جسم و جاں کی کہانی تمام شد

☆☆☆☆

علیم قریشی

احوال

شکست آثار لمحوں سے
ہوا کے زرد جھونکوں سے
اکیلے شہر کی ویران گلیوں سے
کسی بکھرے ہوئے
بے خواب موسم کی کہانی سے
کہیں خود سے
کہیں آوازۂ شب کی روانی سے
کبھی اس کی خبر پوچھیں
کبھی اپنا پتا پوچھیں

☆☆☆☆

جلیل عالی

ذرا سے وائرس نے

ذرا سے وائرس نے
دوڑ لگوا دی جہاں بھر کی
عزیزوں، دوستوں کے درمیاں بھی
فاصلے دیوار کر ڈالے
دنوں میں
شہر بن،
گھر غار کر ڈالے
جہازوں کو زمیں بستہ کیا ایسے
پرندے پر کٹے جیسے
رنگیں جام،
صبحیں شام کر ڈالیں
لگائے دفتروں، تعلیم گاہوں،
معبدوں پر خوف کے تالے
بھرے عشرت کدے، شاپنگ پلازے
کر دیے ویران
اور سنسان
سارے کوچہ و بازار کر ڈالے
دلوں پر دہشتوں کے
کیسے کاری وار کر ڈالے
ہر اک احساس پردے پر

نمایاں موت کے آثار کر ڈالے
بدل ڈالے بیانی زاویے
سب فلسفے بیکار کر ڈالے

☆☆☆☆

سعادت سعید

زاغنوں کی بازی گریاں

کھانستی ہواؤں نے گرسنہ تمدن کو بے نقاب کر ڈالا
تھوکتی ثقافت کو بے حجاب کر ڈالا

اک بلائے بے سر نے
رونقوں بھرے مسکن
یوں اجاڑ ڈالے ہیں
جیسے سارے رستوں میں دیو آن بیٹھے ہوں

مرگ رنگ جھونکوں نے
سانس لیتے باغوں کی زینتیں سموئی ہیں
ناگنی ہیولوں کی قریہ قریہ پھنکاریں
بے ثبات آدم کو زہر سے ڈراتی ہیں

آفتوں کی دیواریں خوف کے پرندوں سے
بھر گئی ہیں چپکے سے
اک وبائے بے درماں خوں کے آبشاروں میں
دھیرے دھیرے بہتی ہے
فتنہ جو طواقت کو شرم کے خرابیں نے
آب آب کر ڈالا

ماہِ آدمیت کو داغ داغ کر ڈالا
میڈیا کے بازوں کو زاغ زاغ کر ڈالا

اسلم گورداسپوری

کرونا سے کیا ڈرنا

یہ کیا مرض ہے کہ جس کے ڈر سے
تمام دنیا لرز رہی ہے
یہ کیا وبا ہے کہ جس کے آگے
ہر ایک کا سر جھکا ہوا ہے
وہ آسمانوں پہ جانے والے
وہ چاند سے مٹی لانے والے
کہ سب پہ اتنا ہے خوف طاری
ہر ایک گھر میں چھپا ہوا ہے
یہ سارے مذہب یہ سارے ایٹم
بس اک کرونا کی مار نکلے
اب ایسے عالم میں دیکھ لیں سب
کہ چین کیسے ڈٹا ہوا ہے۔۔۔۔

☆☆☆☆

سید تابش الوری

قطعات

دشمن سے لڑنا ہے

کرونا ایک نادیدہ بلا ہے، حملہ آور ہے
مسلح ہو کے میدانِ عمل میں آگے بڑھنا ہے
ہم انساں اشرف المخلوق ہیں ہر جنگ جیتیں گے
ہمیں ڈرنا نہیں بچ بچ کے اس دشمن سے لڑنا ہے

0

مولا!

کس بلا کی ہے چلچلاتی دھوپ
رحم کے سائبان میں رکھنا
ہم کہاں امتحاں کے قابل ہیں
مولا! اپنی امان میں رکھنا

☆☆☆☆

خالد مصطفیٰ

زندگی رُک گئی

ہر طرف بھیڑ تھی
جا بہ جا شور تھا
ہر نفس برق رفتاری سے
اپنی منزل کی جانب رواں تھا مگر
ایک نادیدہ جرثومے نے ایسی یلغار کی
دیکھی یوں چلنے والوں کی رفتار کی
زندگی رُک گئی
منزلوں کی طرف بڑھنے والے قدم سست پڑنے لگے
ایسی آندھی چلی کہ تناور شجر تک اکھڑنے لگے
موت رقصاں ہے کوچہ و بازار میں
شہر سنسان ہیں
گاؤں ویران ہیں
مسجدیں بے صدا، مدرسے بے نوا
گھر کے باسی گھروں میں ہیں بے آسرا
ہر طرف خامشی، ہر کہیں بے بسی
میرے مولا یہ کیا ماجرا ہو گیا
تو خفا ہو گیا؟
کون ہے تیرے بندوں کا تیرے سوا
تو ہے مشکل کشا
المدد، اے خدا، المدد، اے خدا

ثروت زہرا

ہوا کی کوکھ

قرنطینہ
ہوا کی کوکھ
ٹھنڈی مٹی کے بوجھ سے
دوہری ہو رہی ہے
خوف تاریک کمروں سے نکلنے والے
سارے راستے مسدود کر چکا ہے
حوصلے جراثیم کش ادویات کے
بھاؤ تاؤ میں مصروف ہیں
کونپلوں نے سبز روشنی سے
ہاتھ ملنے کے ارادے ترک کر دیے ہیں
دلوں کی انگیٹھیوں میں پڑی ہوئی
سرخ بھبوکا آگ سرمئی راکھ میں بدلنے لگی
فاصلے ضرب کے آزمودہ فارمولے آزمانے لگے
تنہائی چپ چاپ پڑی اگلے دنوں کی منصوبہ بندی کرنے لگی
نحوست نے چوباروں کے پیر زخمی کر دیے
موت کی دھیمی چاپ سے
سماعتیں بھس کی طرح بھر دی گئیں
مگر میں۔۔۔۔تمہارے
صرف تمہارے ساتھ قرنطینہ میں جانا چاہتی ہوں

☆☆☆☆

ڈاکٹر شاہد اشرف

وبا سے بچ گیا تو

میں اپنے گرد چلتے پھرتے، بوجھل لڑکھڑاتے،
ڈر کے مارے، ایک دوجے سے گریزاں،
معجزے کے منتظر لوگوں کو دیکھے جا رہا ہوں
انھی کے درمیاں، میں بھی کہیں ہوں
اور فرصت کے دنوں کا سوچتا ہوں
کئی لوگوں سے ملنا چاہتا تھا
پھر بھی ملنے کا میسر وقت ضائع کر رہا تھا
وبا سے بچ گیا تو پہلے اپنے خانداں کے اُن بزرگوں سے ملوں گا
جن کے البم میں مرا بچپن مہکتا ہے
میں اپنے گاؤں جاؤں گا
محلے کے پرانے نقش ڈھونڈوں گا
بہت سے دوستوں کے فون نمبر میو کر کے بھول بیٹھا ہوں
مجھے جن کی خبر کوئی نہیں ہے
بتاؤں گا کہ میں زندہ ہوں لیکن دوسری جانب سے جانے کون بولے گا؟
میں اپنے مہرباں اُستاد کے گھر میں قدم بوسی کو جاؤں گا
کئی شاگرد نالاں ہیں
گریڈوں نے غلط فہمی کو گہرا کر دیا ہے
اُن کو سینے سے لگا کر یہ کہوں گا
زندگی میں کامیابی ان گریڈوں کی نہیں محتاج ہوتی ہے
کتابیں جن کو پڑھنے کی کبھی نوبت نہیں آئی

اٹھا کر گرد جھاڑوں گا
انھیں روزانہ کی بنیاد پہ پڑھنے کی کوشش بھی کروں گا
کبھی یونیورسٹی میں پسندیدہ جگہ پہ راہداری میں ابھرتے قہقہے سننے کو جاؤں گا
جہاں اک چاپ کی خاطر مسلسل بیٹھنا تسکین دیتا تھا
وبا سے بچ گیا تو
ایک دن مرحوم بھائی کی لحد پہ فاتحہ خوانی کو جاؤں گا
میں آدھا اس لحد میں دفن ہوں، آدھا زمیں پہ منتظر ہوں
کسی کو کیا خبر ہے
اس وبا سے نکلنے والوں میں نجانے کون شامل ہے؟

☆☆☆☆

نیلما ناہید درانی

قیامت آچکی ہے

قیامت آچکی ہے
مگر سونے ہوئے ہیں
وہ سانسیں جن کو اوڑھے جی رہے تھے
انہی سانسوں سے اب ڈرنے لگے ہیں
عجب ہے موسم گل میں
خزاں جیسی اداسی ہے
سنہری دھوپ میں زردی ہے
اور اپنے ہی سایوں سے
ڈرے، سہمے ہوئے انساں
گھروں میں اب مقید ہیں
سبھی شیر اور گیدڑ، ہاتھی اور چوہے
بس اپنا منہ چھپانا چاہتے ہیں
بس اپنے ہاتھ دھونا چاہتے ہیں
وہ چیزیں جو دکانوں پر
کبھی بے مول ان کی راہ تکتی تھیں
سبھی نایاب ہیں
اور شیلف سب خالی پڑے ہیں
جو چہرے خوف اوڑھے گھومتے ہیں
یہ خالی شیلف ان پر ہنس رہے ہیں
☆☆☆☆

امین اوڈیرائی

لاک ڈاؤن

اک وبا نے زمیں کو گھیر لیا
زندگی کرب میں سمٹ سی گئی
جو جہاں تھا وہیں پہ جم گیا تھا
جس کو دیکھا وہی تھا سہما ہوا
بات اک فرد کی نہیں تھی وہ
بات دنیا کے تھی بچاؤ کی
سو وبا سے نپٹنے کا یارو!
بس یہی ایک راستہ تھا کہ سب
شہروں، قصبوں کہ ان دیہاتوں میں
بچے، بوڑھے، جوان، مرد و زن
کچھ دنوں کے لیے گھروں میں رہیں
میں تو اک شہر کا ہوں باسی جہاں
میں نے دیکھے ہیں بے گھری کے ستم
سو زمانے کی گردشوں میں امین
اعلیٰ حکام کی طرف سے یہاں
گھر میں رہنے کا حکم ملتے ہی
کتنے فٹ پاتھ پہ پڑے ہوئے لوگ
سوچتا ہوں کدھر گئے ہوں گے۔۔۔!!

☆☆☆☆

نجمہ منصور

قرنطینہ میں جینے والے

قرنطینہ میں قبر جیسی خاموشی
بنا آواز کے بین کر رہی تھی
اور قرنطینہ کی کھڑکی سے جھانکتی
دو آنکھیں
کسی اپنے کو دیکھنے کی حسرت لیے
ٹکٹکی باندھے
اس زنگ آلود چٹخنی کو تک رہی تھیں
جو شاید برسوں سے بند پڑی تھیں
کھڑکی کے بالکل پاس آ کر
نوے کے زاویے پر جھکی اس کی آنکھیں
یکدم برسنے لگیں
بالکل کل رات موسلا دھار ہونے والی بارش کی طرح
اس کے اندر اور باہر کے موسم آپس میں گڈ مڈ ہونے لگے
اس گھوری کھڑکی کے بالکل سامنے ایستادہ
بے نام پیڑ پہ دو پرندے
اسے اپنے آپ سے زیادہ خوش بخت لگے
جو چونچ سے چونچ ملائے بے خبر بیٹھے تھے
اس کے سرخ پپوٹوں سے جھکی پرانی یادیں
اس کا منہ چڑانے لگیں
اس سے پہلے کہ

موت کا الارم بجتا
اس سے بھی پہلے کہ
ایک بے جان خلیے کا خوف دھیرے دھیرے
اسے زندہ کھا جاتا اور
اس کا کھنکتا ہوا بدن
دھنکی ہوئی روئی کی طرح
کسی پلاسٹک بیگ میں تحلیل ہو جاتا
وہ ٹھان چکی تھی کہ
اسے قرنطینہ میں موت کا ذائقہ
ہرگز نہیں چکھنا
وہ ٹھان چکی تھی کہ
اسے ابھی بہت جینا ہے!!!

☆☆☆☆

ساجد سومرو

آلودہ فضا کا ماتم

آلودہ فضا کا ماتم
شہر کی فضا آلودہ ہو چکی ہے
کسی وائرس سے
جو زندگیوں کو تنہا ہونے پہ
مجبور کر رہا ہے
انسان انسان کو چھونے سے
ڈر گیا اور سانسیں
سانسوں میں ملنے سے خوف کھا کر
سینے میں دفن ہو چکیں
لوگ ہجر کے تصور سے
حواس باختہ ہو کر
عشق کی جڑیں کاٹتے
اور محبت کے درخت پہ
لعنت بھیجتے ہوئے
وصال وصال کرتے رہے
میں نے اس آلودہ فضا میں
تمہارے تصور کا ماسک
خیالوں پہ اوڑھ کر
ان تمام سوچوں سے
دل پاک کیا

جو مجھے ڈراتی ہیں
تمہارے لکھے لفظ
اور وہ پتھر پہ لکیر جیسا آفاقی سچ
کہ تم میرے وجود سے
اور میں تمہاری روح سے تخلیق ہوا
سب سے خوبصورت سچ قرار پائے
سو میں نہیں ڈرتا
فضائی آلودگی سے جب
ہر شخص تنہا ہو
اور گھروں میں مقید اجسام
محبت کے لیے سسک جائیں
کیونکہ میرے جسم نے
تمہارے جسم سے محبت نہیں کی
میری روح نے تمہاری روح سے
محبت کا جام پیا
اور تم کو خدا مان لیا
کوئی بھی آلودگی
روح کو روح سے
جدا نہیں کر سکتی

☆☆☆☆

ڈاکٹر محمد کامران

ابھی میرے جینے کے دن ہیں

ابھی میرے جینے کے دن ہیں
ابھی دل امنگوں سے آباد ہے
ابھی زندگی کے کئی ایسے رنگ اور کئی ذائقے ہیں
جو اگلی گلی میں مرے منتظر ہیں
ابھی کتنی ہی بستیاں اور کتنے جزیرے مرے خواب میں آرہے ہیں
ابھی میں نے دنیا کو تھوڑا سا دیکھا ہے
سمجھا نہیں ہے
ابھی میں نے اس پیکرِ حسن کو کھل کے دیکھا نہیں ہے
ابھی اس کی آنکھوں کی حیرانیوں پر مری نظم پوری نہیں ہو سکی ہے
ابھی ریت مٹھی سے پھسلی نہیں ہے
ابھی زندگی مجھ سے روٹھی نہیں ہے
ابھی میرے جینے کے دن ہیں
ابھی میرے جینے کے دن ہیں

☆☆☆☆

ازہر ندیم

جب پھول کھلیں گے ہاتھوں پہ

جب پھول کھلیں گے ہاتھوں پہ
جب خوشبو رنگ بکھیرے گی
اس خواب کا موسم دور نہیں
جب لمس کی کومل سی تتلی
اترے گی ہر اک ماتھے پہ
جب دیپ جلیں گے آنکھوں میں
جب آس کی ننھی سی پیلو
ہر سمت اجالے لائے گی
اک یاد کو دل میں بھر لینا
یہ وعدہ خود سے کر لینا
یہ خوشبو رنگ ہوا تتلی
اس دنیا کی تعبیریں ہیں
جو سب کی ساجھی دنیا ہے
یہ سانسیں ایک امانت ہیں
یہ ہونا سب کا ہونا ہے
جب پھول کھلیں گے ہاتھوں پہ
جب خوشبو رنگ بکھیرے گی
اس خواب کا موسم دور نہیں

☆☆☆☆

رخسانہ صبا

لاتحزنوا

یقین رکھو
نئے مغنّی
ستار کے تار چھیڑ دیں گے
کسی نئی لَے پہ سرمدی گیت پھر سنو گے
تمہارے بچوں کے پھول سے عارضوں پہ بوسے بھی ثبت ہوں گے
سبھی تعلق، تمام رشتے
جو فاصلوں کی منڈیر سے دیکھتے ہیں تم کو
وہ گھر کے آنگن میں بول اٹھیں گے
یقین رکھو
کہ ہم کو اک روز یہ اجازت بھی مل سکے گی
کہ اپنے پیاروں کی میتوں پر بھی رو سکیں ہم
یہ زندگی پھر سے چل پڑے گی
ہماری دنیا، تمہاری دنیا
یہ گہرا صدمہ بھی جھیل لے گی یقین رکھو
یقین رکھو کہ نارِ نمرود، چاہِ کنعاں، عصائے موسیٰ کی وہ صدائیں
حرا کی اور ثور کی فضائیں یہ کہہ رہی ہیں
فرنٹ لائن پہ لڑنے والوں کا جذبۂ بے مثال اک دن
حقیر کیڑے کی سرکشی کو شکست دے گا
بس ایک لا تحزنوا کا نعرہ بچا کے رکھنا

☆☆☆☆

شہزاد نیر

ہراس اک گلی سے دوسری گلی کو چل پڑا

ہراس اک گلی سے دوسری گلی کو چل پڑا
سیاہ رنگ خوف تارکول کی طرح
زمیں کی ہر سڑک پہ پھر گیا
جہاں صدا کے پنچھیوں کی بے خطر اڑان تھی
وہاں پہ اب خموشیوں کے جال ہیں
دلوں سے اٹھ کے خوف آنکھ آنکھ سے ابل پڑا
ہوا میں بے یقینیوں کی باس ہے
نگر نگر ہراس ہے
بدن بدن سے دور، ہاتھ ہاتھ سے ڈرا ہوا
بشر کھلی فضا سے خوف کھا گیا
ہوا سے خوف کھا گیا
محبتوں میں قرب کی ادا سے خوف کھا گیا!
بہار اپنی طشتری میں گل لیے کھڑی رہی
پرندڈھونڈتے رہے
مکان کوچہ گرد ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں، آدمی کدھر گیا؟
اور آدمی نے لڑکھڑاتی سانس سے
کتاب جاں کا آخری ورق لکھا۔۔۔
وصال، قرب، دوستی، بہار، پیار سچ سہی
فنا کے خوف اور
بقا کی بھوک سے بڑا کوئی بھی سچ نہیں!

عنبرین صلاح الدین

2020 کی خود کلامی

ہم زمینو!
گزشتہ برس چند سوداگروں نے
محلات میں بیٹھ کر آنے والے برس کا نیا نقش نقشے پہ کھینچا
جو خلقت بچی تھی، اسے دائرہ دائرہ بانٹ کر پھر نشاں زد کیا
وہ جو محصور تھے ان کو نفرت سے دیکھا
جو آوازیں کانوں کو بوجھل لگیں، وہ دبائیں
وہ قرنوں تلک اب ہوا کے بدن میں سلگتی رہیں گی
اسی سال کچھ سرحدیں اور کھینچی گئیں، کچھ پھلانگی گئیں
اور ہواؤں میں اڑتے ہوئے لاتعلق پرندوں کی پرواز چلتی رہی
ہم زمینو!
گزشتہ برس شہر جلتے رہے، لاشے گرتے رہے
اور معیشت کے پیروں میں بیٹھے ہوئے لوگ بیٹھے رہے
ہر برس کی طرح
ہم غریبوں کو گندم کے چکر میں الجھا کے سرمایہ داری نے اونچے محل، اور اونچے کیے
اس سے پچھلا برس، اور پچھلا برس، ایک جیسے تھے سب
یاد بھی کب رہے
کون سی جنگ آغاز کیسے ہوئی
لوگ کتنے مرے
لیبیا، شام، بغداد، کابل، فلسطین، کشمیر، جلتے رہے
ہم زمینو!

یہاں اسلحہ بیچنے کے لیے چند لوگوں نے لوگوں کا سودا کیا
کون بتلائے گا؟
کچھ خشوگی بتاتا
مگر دجیوں میں بٹا جسم کیسے بتاتا؟
وہ ایلان کردی حقیقت بتاتا
مگر ریت سے اس کے معصوم پیروں کے جوتے بھرے تھے
وہ، ہان وانی کی سر سبز پرچم میں لپٹی ہوئی لاش کیسے بتاتی
یا عمران دقنیش قصہ سناتا
پہ خوں سے اٹے اپنے معصوم چہرے پہ چھائی ہوئی سرد مہری کو کیسے ہٹاتا
بتاتا تو آخر وہ کس کو بتاتا
خدا کو بتاتا؟
خدا جس کے گھر کو بھی پانچ تارا بڑے ریستورانوں نے گھیرا ہوا ہے؟
زمیں تھک گئی تھی
سو فطرت نے رعشہ زدہ ہاتھ کیسے شکنجہ بنائے ہیں
خلقت کو محصور و مجبور کرتے ہوئے لوگ بے بس پڑے ہیں
نئے سال کا سارا نقشہ ہی بکھرا ہوا ہے
نئے سال میں جنگ کے باب میں کچھ نیا تو کیا
نیوکلائی پرانا تماشا ہو، جھگڑا ہو یا تیل پر
سب محاذوں پہ خاموشی ہے
ان محلات، قلعوں میں، ایوانوں میں
سب کو اپنی پڑی ہے
وہ سناتا ہے کہ زمیں کے تنفس کی آواز آنے لگی ہے!

☆☆☆☆

فیروز ناطق خسرو

پکے پھل ٹپکتے ہیں

مرے مالک!
تری دنیا میں کتنے رنگ بکھرے ہیں!
چمن میں پھول کھل کر
ذہن کی ساری تھکن کو دور کرتے ہیں
تو باغوں میں رسیلے پھل ہمارا دل لبھاتے ہیں!
کہیں فرشِ زمیں پر
انگنت اشیائے خورد و نوش کی کثرت سے،
احساسِ تشکر سے!
مری اس چشمِ حیراں میں نمی سی تیر جاتی ہے!
ادھر آلودگی کے بوجھ سے
بوجھل فضاؤں میں بھی صحت بخش
فصلیں لہلہاتی ہیں!
مرے مالک!
ادھر ان نعمتوں سے جگمگاتی تیری دنیا میں
وبا کیسی یہ پھیلی ہے!
کہ جس کی زد میں آ کر یہ رسیلے پھل
فنا کی گود بھرتے ہیں!
زمیں جو کل تلک سونا اگلتی تھی
چٹختی ہے، تڑپتی ہے!
فضائے زہر آلودہ کے بیچوں بیچ پژمردہ گلوں کی

رنگ برنگی پتیاں بھی مُرجھاتی ہیں!
رسیلے پھل جو اپنی اک الگ پہچان رکھتے تھے!
وہ اپنی آج یہ پہچان کھو بیٹھے
خود اپنے ہوش بھی انسان کھو بیٹھے!
دُہائی ہے، دُہائی ہے!
وہی انسان اے مالک!
کہ تو نے جس کی خاطر
یہ حسیں جنت سجائی تھی!
وہی انسان جس کو اشرف المخلوق کا
تو نے لقب بخشا!
وہی انسان "کورونا وبا" کی تیز آندھی میں
بلا تخصیص مرتے ہیں!
کہ جیسے
پیڑ کی شاخوں سے کچے پھل ٹپکتے ہیں!!
☆☆☆☆

پروفیسر اکرم ناصر

ابھی توبہ کا دروازہ کھلا ہے

اذانوں کی صدائیں آ رہی ہیں
ابھی ہم کو پکارا جا رہا ہے
ابھی بھی وقت ہے
سانسوں کی ڈوری ٹوٹنے سے
ایک پل پہلے تلک
توبہ کا دروازہ کھلا ہے
اگرچہ موت کا اب رقص
ہر جانب دکھائی دے رہا ہے
اگرچہ موت کی اب چاپ
ہر جانب سنائی دے رہی ہے
مگر مایوس مت ہونا
ابھی توبہ کا دروازہ کھلا ہے

اندھیرا ہے
مگر ہم پیٹ میں مچھلی کے زندہ ہیں
عذاب آنے کو ہے
لیکن یہ ٹل سکتا ہے
پہلے بھی ٹلا تھا
اگرچہ قید ہیں گھر میں
اگرچہ خوف کی بارش میں نہلائے ہوئے ہیں
گلی کوچے کے سناٹے سے اکتائے ہوئے ہیں

بہت مایوس ہیں اور سخت گھبرائے ہوئے ہیں
اگرچہ موت کے گلیوں میں جھگڑ چل رہے ہیں
گھروں میں قید ہیں اور ہاتھ بیٹھے مل رہے ہیں
مگر سوچو

یہ کیا کم ہے
ابھی ہم موت کی وادی میں زندہ ہیں
گناہوں کی ہے گو فہرست لمبی
ندامت کا بس اک آنسو بہت ہے
اگر توبہ کی ہو توفیق ہم کو
خلوص دل سے بس توبہ بہت ہے
اذانوں کی صدائیں آرہی ہیں
ابھی ہم کو پکارا جارہا ہے
ابھی مایوس مت ہونا
ابھی توبہ کا دروازہ کھلا ہے

☆☆☆☆

شاہین کاظمی

خود کلامی

افلاک سے بوند بوند گرتی
خوف کی اوس
اپنے دامن میں کئی پُر عذاب زمانوں کی باس لیے
شہرِ خواب کو تاراج کیسے دیتی ہے
نئی آنکھوں کی کھوج میں بھٹکے ہوئے خواب
بے صدا دریچوں میں لٹکی خاموش زبانیں
اور گلیوں میں بکھری متعفن تاریکی
شناخت نگل رہی ہے شب گزیدو!
کیا روشنی کا سفر تمام ہوا؟
بے سمتی کا سفر کس لمس تائید کا منتظر ہے
کہ پردۂ شب چاک ہو؟
خود کلامی موقوف کرو
نابود کا آسیب
ہست کے دریچوں میں دھرے چراغوں
پر قابض ہوا چاہتا ہے
یہ ماورائے حواس اندھیرا
ہمیں نگلنے کو تیار ہے
شب گزیدو!
آؤ روشنی کے لیے خود کو آگ لگا لیں

☆☆☆☆

شہناز نقوی

بہار کے دنوں میں اجاڑ موسم

اب کے کیسی بہار آئی ہے
جھاڑیاں بن گئے ہیں پھول سبھی
اور مہک بھی نہیں ہے پھولوں میں
اک اداسی ہے سارے چہروں پہ
کس طرح کا آگیا موسم، اب کے کیسی بہار آئی ہے
کچھ چہک بھی نہیں پرندوں کی
اور سنسان سارے رستے ہیں
شہر خاموش ہو گئے جیسے
اتنے تنہا تو ہم کبھی نہ تھے
اک اداسی ہی گیت گاتی ہے
ایسے قصے تو پہلے سنتے تھے
شہر کے شہریوں ہی مٹتے تھے
انہی قصوں کی ایک سرگوشی، آج بھی تو سنائی دیتی ہے
زرد بادل بھی چھٹ ہی جائیں گے
جو دریچوں میں ہیں رکھے یہ چراغ
ایک دن پھر سے جل ہی جائیں گے
وہی موسم پلٹ کے آئیں گے
میرے اللہ رحم کر ہم پہ
ہر خوشی پھر سے لوٹ کر آئے
زندگی پھر سے لوٹ کر آئے

پروفیسر ڈاکٹر اصغر علی بلوچ

الاماں الحذر

کوچہ و بازار کے چہرے پہ چھائی مردنی
دے رہی ہے اس بلائے ناگہانی کا پتا
اک ہجوم خوف و دہشت چار سو پھیلا ہوا
اختلاط آدمی ہی آدمی کی موت ہے
قرب تنہائی میں رہنے ہی میں اب ہے عافیت
ہر کوئی اب ہر کسی سے بے طرح سہما ہوا
اک طرف ہو کے چھپے رہنے
میں اب ہے زندگی
چارہ گر چارہ گری میں محو ہیں
احتیاط و عزم و ہمت ہی
میں ہے رد بلا
رحم اے رب عطا
مشرق و مغرب کے مالک الحذر
الاماں اے خالق کون و مکاں

☆☆☆☆

منیر احمد فردوس

اپنی سانسیں بچالو

اے میرے شہر کے مکینو......!
اپنے گلی کوچوں سے اپنی چاپ سمیٹو
کچھ دن اپنے شہر سے ہجرت کر کے
ہر طرف اک تنہائی بچھا دو

سنا ہے
اک سانس شکن وائرہ تمھارری تلاش کو نکلا ہے
جو تم میں اتر کر تمھاری سانسوں کو چوس لے گا
اے شہر دل کے اچھے مکینو......!
کچھ دن کو تم شہر میں کو نجتی

اپنی آوازیں
اپنے قہقہے
اپنی باتیں
اپنی عبادت
اپنی اذانیں بھی
سب کو اپنے گھر میں چھپا دو
یہ سب تمھاری سانس سے چلتے ہیں

سنا ہے
اک سانس شکن وائرہ تمھاری تلاش کو نکلا ہے
جو تمھاری سانسوں میں دھڑکتا یہ سب کچھ چاٹ لے گا
اے میرے شہر کے اچھے مکینو......!

بس تم کچھ دن ہجرت کر کے
اس سانس شکن دائرے سے چھپ جاؤ
اور شہر میں مقدس تنہائی بچھا کر
اپنی سانسیں بچا لو
اپنی آوازیں، قہقہے، باتیں، اذانیں
اپنا سب کچھ بچا لو

☆☆☆☆

محمد نصیر زندہ

خروشِ آرزو

چشمۂ دید میں لہلاتے ہیں کھیت انجم کے
آرزو خانۂ افلاک چمکتا ہے ابھی
پیکرِ نور وشِ ناز کا ہے عکس جمیل
جس سے یہ مرتبۂ خاک چمکتا ہے ابھی
لمحۂ وصل ہے جو دیدۂ گردوں کا چراغ
مہر میں تکمۂ پوشاک چمکتا ہے ابھی
روزنِ خواب سے طاؤسِ فسوں جھانکتا ہے
یہ سرابِ خس و خاشاک چمکتا ہے ابھی
اے خداوندِ چمن زار مہ و کاہکشاں
مجھے شربِ لبِ گل فام نہیں دیتا، نہ دے
دانۂ خال تجھے دام نہیں دیتا، نہ دے
مژدۂ عیش مے و جام نہیں دیتا، نہ دے
رخصتِ گردشِ ایام نہیں دیتا، نہ دے
اے نگہ دارِ گل و لالہ و آئینِ بہار
عطر آگیں یہ گزر گاہ فنا رہنے دے
زلف کے ہاتھ میں تزئینِ صبا رہنے دے
پھول کا خوشبو سے پیمانِ وفا رہنے دے
شوخیٔ حسن کا سامانِ ادا رہنے دے
ہاؤ ہو سے ہے یہ جشنِ قدح و جام و سبو
حسرتِ رندِ خرابات کے اسباب نہ چھین

عشوہ و نازِ حسیناں ۔ نظر باز ہے خوب
اس تمنا کے در و بام سے مہتاب نہ چھین
تشنۂ دید رہیں ہجر میں چشمانِ خیال
اے خدا مجھ سے عذاب ۔ نگہ خواب نہ چھین

☆☆☆☆

گوتم ملتانی

کوئی دن آئے گا جب خوش خبری آئے گی

روشنی گھٹتی چلی جاتی ہے رفتہ رفتہ
شہر بھی چپ، در و دیوار بھی سہمے ہوئے ہیں
زندگی خوف کی زنجیر میں جکڑی ہوئی ہے
وسوسے کتنے ہی ہر شخص سے لپٹے ہوئے ہیں

کیا خبر کب کوئی اپنا کوئی جاں سے بڑھ کر
ملنے آ جائے، اسے ہاتھ ملانا پڑ جائے
اور اس تھوڑے سے اخلاص و مروت کے سبب
عین ممکن ہے ہمیں جان سے جانا پڑ جائے

گو کہ اس حال میں امید تو کم ہے گوتم
پھر بھی لگتا ہے کہ قدرت کی مدد آئے گی
منتظر رہنا ہے ، مایوس نہیں رہنا ہے
کوئی دن آئے گا جب خوش خبری آئے گی

☆☆☆☆

حمیدہ شاہین

نظم

جانے کیا دور تھی
تو نے کچھ دیر کو
ٹھہرنے، سوچنے کا اشارہ دیا
یا خدا شکریہ
دائیں بائیں سبھی سگنلوں پر جو سرخی کا ہالہ بنا
اس نیا اس بھاگتی، اپنے رستے کی ہر چیز کو روندتی
تیز رفتار دنیا کو ٹھہرا دیا
گھومتی، شور سے کان بھرتی ہوئی چرخیاں رک گئیں
جانے کیا دور تھی
زندگی اپنے پیروں میں پہیے پہنے ہوئے
اپنی آنکھوں پہ خواہش چڑھائے ہوئے بھاگتے ہی چلے جا رہے تھے سبھی
اتنی مہلت نہ تھی
رک کے دیکھیں ذرا
کون پیچھے گرا
کون کچلا گیا
کون پہلو میں ہے
آئینہ دیکھنے کی بھی فرصت نہ تھی
اپنے پیاروں کے چہرے بھی دھندلے سے تھے
ایک چابک بدن پر برستا تھا بس
کچلا جائے گا جو ایک پل بھی رکا

یا خدا شکریہ
تو نے جھٹکا دیا
اور اک بار پھر سب کو سمجھا دیا
زندگی کو سدا ساتھ لے کے چلو
ورنہ مر جائے گی

☆☆☆☆

عائشہ مسعود

بحکمِ ربی وبا ٹلے گی

خدا کسی سے خفا ہوا ہے
وہ نسلِ آدم کے ہر قبیلے سے ہی خفا ہے
کہا ہے اس نے کہ لوٹ جاؤ
نہیں ضرورت عبادتوں کی
خدا نے ہم سے ہر اک مقدس مقام خالی کرا لیا ہے
ہمیں ہمارے ہی گھر کے اندر کی حد میں رہنا سکھا دیا ہے
تو اب اجازت نہیں ہے ہم کو
گلی گلی دندناتے پھرنا
ادھر لپکنا، اُدھر جھپٹنا
ادھر سے اٹھنا اُدھر کو گرنا
جہان بھر کے ہی کھکلا ہوں کو ایک نشہ تھا طاقتوں کا
نظر نہ آئی وہ سوختہ جاں سلگتی دنیا
فسردگی کو ترستی دنیا بلکتی دنیا
وہ چپ کے پہرے میں سب مباحث بھی گم ہوئے تھے
کہاں کہاں تک منافقت کے نہ بیج ہم نے اُگا دیئے تھے؟
دعا کرو اب کہ اپنے سر سے بلا ٹلے گی
بحکمِ ربی وبا ٹلے گی
تو زندگی کے نئے سفر میں
وہ لوگ سارے جو بے جنازہ ہی دفن کرنے اٹھا لیے تھے
جو بن دکھائے دبا دیئے تھے

یہ بحث بھی اور نئے مباحث
سوال سارے جواب سارے جو مجھ میں
انھیں اگر پھر سے چھیڑنا ہے
تو زندگی کی دعا کرو تم......
خدا کسی سے خفا ہوا تھا

☆☆☆☆

سجاد اظہر

ہم قرنطینہ میں ہیں

ہم قرنطینہ میں ہیں
جس روز کاغذ ایجاد ہوا تھا
اس روز دنیا سے اعتبار اٹھ گیا تھا
لوگ اب روایتوں کی بجائے
لکھے ہوئے مستند حوالے مانگتے تھے
آٹے کے بدلے کپڑا انہیں دیتے تھے
بدلے میں روپیہ مانگتے تھے
نیکی کو دریا میں ڈالنے کی بجائے
اس کا دام طلب کیا جاتا تھا
اور جو دام نہیں دے سکتا تھا
اس کا لاک ڈاؤن کر دیا جاتا تھا
حد تو یہ تھی کہ سب عبادتیں بھی
کاغذ کی محتاج کر دی گئی تھیں
اس سے پہلے کہ کاغذی انسان
خدا کی حیثیت بھی کاغذی کر دیتا
خدا نے فیصلہ کیا کہ وہ دنیا میں
اپنے گھر کو تالا لگا دے
اور اس کاغذی دنیا کو
قرنطینہ میں ڈال دے

☆☆☆☆

آمنہ ابڑو کنول

خیال

ہم ایک خیال کے دریا کنارے ملے تھے
جہاں احساس کے درختوں پر
اُداسی کے پتے
کسی گہری کھائی میں گرتے جاتے تھے
دل میں وسوسوں کا راج ہے
آئینوں میں بنتے بگڑتے عکس
اپنی مکروہ شکلوں پر درد کی سیاہی ملتے ہیں
ہم جو کانٹوں بھرے راستوں پر
اپنے لہو سے نقش کاڑھتے
اپنی حیات کی رس بیری سے
قطرہ قطرہ ٹپکتے ہیں
درختوں پر چڑیلوں کا راج ہے
اُن کی مکروہ چیخیں
جنگل کے سناٹوں کو چیرتی ہیں
بلاؤں نے شہر کے گرد حصار کھینچا ہے
موت نے سفید لباس پہنا
اور دھوکا دینے چل نکلی
اَن گنت وجود بے جان ہوئے
چلو ان کو گہری کھائی میں ڈال دیتے ہیں
معصوم چہرے زردی مائل دکھنے لگے

پتھرآنکھوں میں جدائی رقص کرتی ہے

بھنچے ہوئے ہونٹوں میں نوحے قید ہیں

کوئی حرفِ تسلی

آئینے میں بند تھا، وہ ٹوٹ گیا

سسکیاں بھرتے لفظ

اپنی ہونے پر شرمندہ ہیں

محبت کے مزار پر بنی تصویریں

آنے والی نسلوں کے لئے سبق ہیں

جب ہم نے کسی کے ہجر میں رقص کرتے کرتے

دم توڑا تھا

خیال نے جھرجھری لی

جب زندگی نے انگڑائی لی

تو اس کے زندہ مساموں سے موت بہہ نکلی

ہوائیں مسموم بھی ہیں مغموم بھی

سمندروں کی حد باندھنے والے

ہوا کو مٹھی میں بھر

اور پرندوں کا شور

ہماری سڑکوں پر اُنڈیل دے

☆☆☆☆

فاطمہ مہرو

موت ہمیں گلیوں گلیوں ڈھونڈتی رہے گی

موت ہمیں گلیوں گلیوں ڈھونڈتی رہے گی
اور ہم اس سے آنکھ مچولی کھیلتے
بہار کے بچے کھچے لمحے
گزارنے کی سعی میں
ایک دوسرے کو لمبی فون کالز پہ
بوسوں کے تبادلوں کے منصوبے
ترتیب دیتے رہیں گے
وہ ہمیں ڈھونڈتی ادھر آنکلے
اور "Hide" کی باری ہماری ہو
پھر بھی ہم اپنے محبوب کو
بستر مرگ پہ
جنونی خطوط لکھنے سے باز نہ آئیں گے
ہم چاہیں گے
کوئی شدید پیاس کا مارا ہمیں
شیشے کے پار سے جھانکتا رہے
چاہتا رہے
کہ ہم موت کی بانہوں سے اس کی بانہوں میں
باحفاظت منتقل کر دیے جائیں
ہم چاہیں گے
کوئی یار ہمارا

یہاں وہاں سے نظر بچا کر
آنکھ مارتے ہوئے
ایک سُلگا سگرٹ ہماری طرف اچھال دے
ایک سنہری لمحہ اپنے پاس سنبھال لے
ہم چاہیں گے
اونچی ایک آواز لگائیں
اور اپنے سپنوں کی لمبی لسٹ سنائیں
یہ سب سُن کر سارے لوگ خموش ہو جائیں
اور ہمیں ماضی کی طرح پھر خبطی سمجھا جائے
ہم چاہیں گے، ہم بدلے کی آگ جلائیں
اور پھر اس میں اپنے سچ اور جھوٹ سے کُندن ہار بنائیں
جس جس نے ہم کو روگ لگایا
اس بستر سے بھاگیں، جا کر اس کو مل کے آئیں
اور دکھائیں دُکھتی رگ کا روپ سروپ
ہم چاہیں گے، کوئی ہمیں ملنے نہ آئے
اور ہم چھت کو کتنے ہی گھنٹے
یہ سب سوچ، تکتے جائیں
موت ہمیں آواز لگائے
اس سے پہلے
ہم پھر "اس" سے ملنے جائیں
اور اُسے زندگی کے ساتھ مصروف پا کر
روتے روتے واپس آئیں
اک آخری بار بھرپُور مُسکرا کر
موت کی آغوش میں سو جائیں

زیب النساء زیبی

ہمیں پُر عزم رہنا ہے

"ہمیں کرونا سے نہیں مرنا"
کون کہتا ہے؟
موت کا خوف محبت کو مار دیتا ہے۔۔۔۔۔
وہ میرا ہاتھ تھامے کہہ رہا تھا۔۔۔
حوصلہ رکھو! کچھ نہیں ہے تم کو۔۔۔۔
کچھ نہیں ہوگا۔۔۔۔
جسم کو موت آ بھی جائے تو۔۔۔۔
روح زندہ رہتی ہے۔۔۔
تم نے بھلا یہ سوچا کیسے۔۔۔۔۔
ہم کرونا سے مریں گے۔۔۔۔
ہمیں پُر عزم رہنا ہے
ہمیں کرونا سے نہیں مرنا۔۔۔۔۔
میں چیخی! نہیں نہیں مجھ سے دور ہو جاؤ۔۔۔۔۔
مجھے ایمبولینس منگوا دو۔۔۔۔
کوئی میرے پاس نہ آئے۔۔۔۔
ہائے میرا دم گھٹ رہا ہے۔۔۔
حلق خشک ہے۔۔۔۔دل بند ہونے کو ہے۔۔۔
شاید مجھے کرونا ہو گیا ہے۔۔۔۔
بس جلدی کرو۔۔۔۔
ہائے ایمبولینس منگواؤ۔۔۔۔

میرے جسم میں الیکٹرک شاک دوڑتا ہے۔۔۔۔۔

یہ میری روح کھینچتا ہے۔۔۔۔

میرے بچوں کو مجھ سے دور کردو۔۔۔۔۔

ایمبولینس میں، میں اکیلی جاؤں گی۔۔۔۔۔

وہ ماسک لگائے، دستانے پہنے۔۔۔۔۔

ایمبولینس میں آبیٹھا۔۔۔۔۔

میرے گرتے وجود کو سنبھالا۔۔۔۔۔

ڈاکٹر نے سکوں کا انجکشن دیا۔۔۔۔۔۔

میں سوتی رہی۔۔۔۔۔

آنکھ کھلی تو وہ پر عزم لہجے میں بولا ۔۔۔۔

دیکھو! میں نہ کہتا تھا۔۔۔۔۔

تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔۔۔۔

لو دیکھو! ہم دونوں کی رپورٹ نیگیٹو ہے۔۔۔۔۔

بس یاد رکھو!

ہمیں پر عزم رہنا ہے۔۔۔

ہمیں کرونا سے نہیں مرنا۔۔۔۔۔

☆☆☆☆

مظفر حسن بلوچ

بقائے حیات

شہر خالی ہو گئے ہیں، راستے ویران ہیں
جام الٹے ہو گئے ہیں، مے کدے ویران ہیں
بلبلیں باغوں سے رخصت ہو گئیں افسوس ہے
ٹہنیاں پھولوں سے خالی ہو گئیں افسوس ہے
جن پہ جھولے جھولتے تھے وہ شجر خاموش ہیں
ہیں مکانوں میں مکیں چپ بام و در خاموش ہیں
کیا قیامت ہے کہ اب یاروں کی محفل لٹ گئی
دیکھتے ہی دیکھتے وہ انجمن ہی اٹھ گئی
عشق اب دیدار کو ترسے گا صد افسوس ہے
حسن اب بیمار کو ترسے گا صد افسوس ہے
شاعروں کا درد پہلے سے سوا ہو جائے گا
سبزہ ء نو رستہ بھی بیمار سا ہو جائے گا
لوگ اپنے بھی یہاں انجان سے ہو جائیں گے
آشنا جو ہو گا وہ نا آشنا ہو جائے گا
ہم نے جو سوچا نہیں تھا وہ قیامت آئے گی
وقت کی گردش ہمیں اس موڑ پہ لے آئے گی
آسیائے گردشِ ایام تھم جانے کو ہے
صبح نو آنے کو ہے اور شام غم جانے کو ہے
آزمائش کی گھڑی میں یہ صلائے عام ہے
دین کا اے غم زدو ! لا تقنطو انعام ہے

رحم کر ان ناتواں کندھوں پہ مولا رحم کر
رحم کر ان پھول سے چہروں پہ مولا رحم کر
عرش تک میری مظفر یہ صدا جانے کو ہے
موت اب مرنے کو ہے اور زندگی آنے کو ہے

☆☆☆☆

سعید عباس سعید

نئے دنوں کے ضابطے

گلاب موسم ابھی عدم سے نہیں جو اترے
پیام ان کا ملا ہے مجھ کو
کہ اس برس کوئی بھی نہ سرِ چمن کو نکلے
کہ اس برس کی بہار کے اپنے ضابطے ہیں
نئے قرینوں کی محفلیں ہیں
نئے طریقوں کے رابطے ہیں
مصافحے سے گریز ہوگا
بجائے ہاتھوں کے دل ملیں گے
نئے دنوں کے یہ ضابطے ہیں
کہ آنے والے دنوں کے ضامن
یہ فاصلے ہیں

☆☆☆☆

نذر عابد

اگر بچ گئے تو

اگر بچ گئے تو
کسی کو سنائیں گے
یہ نظم اپنی
کہ جس میں
بچھڑ جانے والوں کے
چہروں پہ بکھری ہوئی
نا اُمیدی کی
اُس راکھ کو
کچھ سمیٹا گیا ہے
کہ جس میں
اُمید اور مسرت کی چنگاریاں
جل بجھی ہیں
اگر بچ گئے تو
کسی کو سنائیں گے
یہ نظم اپنی
جو اک آئینہ ہے
کہ جس میں
بنی نوعِ انساں کے
وہ دکھ جھلکتے ہیں
جو بے بسی

اور لاچاریوں کے
کڑے اور سفاک موسم کے ہاتھوں
بہت جاں فشانی سے
ہم نے سہے تھے
اگر بچ گئے تو
کسی کو سنائیں گے
یہ نظم اپنی
جو روداد ہے
رزم گاہِ حیات آفریں کی
جہاں ہم نے
ان دیکھے دشمن سے
اک جنگ ایسی لڑی تھی
کہ جس کا
ہمیں تجربہ ہی نہیں تھا
اگر بچ گئے تو
کسی کو سنائیں گے
یہ نظم اپنی
مگر بچ گئے تو
یہ کس کو خبر ہے
کہ اس نظم کو پھر
کسی کو سنانے کی، سننے کی
فرصت بھی کیسے ملے گی
کہ ہم سب
نئی زندگی کے

نئے رنگ ترتیب دینے میں
مصروف ہوں گے
نئے باغ ہوں گے
نئے پھول ہوں گے
سو ہم بھی یقیناً
نئی نظم لکھنے میں
مشغول ہوں گے

☆☆☆☆

خرم جمیل

دعا کے ہاتھ

دعا کے ہاتھ ہوتے ہیں
دعائیں رنگ لاتی ہیں
دعا دل سے گزرتے حرف
کی صورت سوالی کو
بڑی تسکین دیتی ہے
سوالی بھول جاتا ہے
سوالوں میں چھپے
سب غم
دعائیں رنگ لاتی ہیں
دعا کے ہاتھ ہوتے ہیں

وبا کے دور میں
کچھ دیر ہی رہنا پڑے
گھر میں تو جبراً
روک لینا خواہش آوارگی کو
دلوں میں بسنے والے ہو
گھروں کو لوٹ جاؤ تم
کہ رستہ صاف ہو جائے
وبا کو راستہ واپس
نکلنے کا ملے گا سو

ہمارے دیس سے
الٹے قدموں لوٹ جائے گی
دعا درویش کی
ایسے یقیناً بری آئے گی
دعا کے ہاتھ ہوتے ہیں
دعائیں رنگ لاتی ہیں

☆☆☆☆

حفیظ تبسم

وبا کے چار دنوں کی ایک نظم

(1)

لاک ڈاؤن کے اعلان پر
پیٹ بھرے لوگوں نے جشن سا منایا
اور برسوں کے بھوکے لوگ اداسی کی دلدل میں دھنس گئے
میں نے سوچا کہ
زندہ رہنے کے لیے خوراک ضروری ہے
یا
تازہ سانس
اور کوئی فیصلہ نہ کر پایا

(2)

گھر میں ذخیرے کے نام پر
اشیائے خورد و نوش موجود تھیں
جو ایک شام بھی پیٹ بھرنے کے کام نہ آ سکیں
بوڑھی ماں نے اپنے حصے کی روٹی میرے سامنے پیش کر دی
اور جوان بیوی نے بچوں کو
میں نہ سوچ پایا
کہ مائیں بھوکے پیٹ
بچوں کی پر مسرت زندگی کے خواب کیسے دیکھ لیتی ہیں

(3)

میں سوچتا ہوں

کہ رات لمبی ہے یا دن
جس کا شور میرے بدن پر ناخن رگڑ رہا ہے
مگر شور کہاں ہے؟
ہر طرف ہو کے عالم میں
بچوں کی سرگوشیاں سنائی دے رہی ہیں یا
ماؤں کی دعائیں
جو آسمان کے خدا
اور زمین کے ناخداؤں کے کان میں جانے سے پہلے
جھاگ کے بلبلے کی طرح دم توڑ رہی ہیں
میرا دل خوف سے ڈوب رہا ہے
میں لرزتا ہوں
اور رحم کی تمنا میں رو دیتا ہوں

(4)

چوتھا دن
مہینے، سال بن کر گزر رہا ہے
اور میرے اندر
زندہ رہنے کی خواہش دم توڑ رہی ہے
میں لرز کر بولتا ہوں
خدا!
اے ہمارے انسانوں کے خدا!
میں موت کے کھیل میں ہار چکا ہوں مگر
میں نے زندہ رہ کر
بچوں کی خوراک
اور بوڑھی ماں کے دمے کی دوا خرید لی ہے

ڈاکٹر نزہت عباسی

''کورونا''

دور تک تنہائیاں ویرانیاں بچھنے لگیں
اب درودیوار پہ خاموشیاں بجنے لگیں
زندگی اور موت کے اب فاصلے کم ہو گئے
وہ ہوا چلنے لگی کہ قربتیں مرنے لگیں
ہر طرف ہے خوف کا عالم خدایا خیر ہو
آپ اپنے آپ سے پرچھائیاں ڈرنے لگیں
اس طرح مایوسیاں پھیلی ہوئی ہیں جابجا
روشنی کے شہر میں بھی مشعلیں بجھنے لگیں
دب گیا شہنائیوں کا شور جس سے دفعتاً
گردش و آلام و غم کی نوبتیں بجنے لگیں
اس وبائے عام سے محفوظ تو سب کو ہی رکھ
اے خدا ساری فضائیں اب دعا کرنے لگیں
اے کرونا تیرے باعث باغِ ہستی میں مرے
حبس ٹوٹا تو ہوائیں درد کی چلنے لگیں
عزم لیکن قوم کا بڑھتا رہا ہے اس طرح
رشک جس پہ دوسری اقوام بھی کرنے لگیں
اب مسیحا تیرے ہاتھوں زخم بھی بھرنے کو ہیں
موسمِ گل میں امیدیں چار سو کھلنے لگیں

☆☆☆☆

ناصر عدیم

صبحِ طلوعِ زندگی

شاخِ زماں پر
فصلِ گل
گھٹنے لگی ہے مُردنی
بے برگ سے لمحات کا دستِ تہی
یوں ہی رہے گا بے ثمر؟
ماتم کناں ہیں طائرانِ خوش نوا
اب تو صبا کا لمس بھی مسموم ہے
ہر ایک در
ہر ایک گھر
زیرِ حصارِ مرگ ہے
صبحِ بقا کی روشنی
شامِ ابد کی چاندنی
گہنا گئی
ہر اک نگر سنسان ہے
ہر اک گلی میں ناچتی ہیں وحشتیں
جو منچلی شامیں کبھی آباد تھیں
تیرے وجودِ ناز سے
ویران ہیں
دالان میں
وہ کرسیوں کا دائرہ وی اسلوب مردہ پڑ گیا

وہ ہم سخن، وہ ہم نوا، وہ قہقہے، وہ محفلیں
نذرِ کرونا ہو گئیں
اب تو اسی دالان کی تنہائیوں میں
چائے کا کڑوا کسیلا کپ لیے
بیٹھا ہُوا ہوں اس طرح
انجان سے اک منطقے میں
اجنبی جیسے کوئی بھولا ہوا ہو راستہ
جیسے کسی حرفِ دعا کے
سائے سے محروم ہوں
چارہ گروں کے چارہ گر!
تیرا کرم جو ساتھ ہو
یہ اک ذرا سا وائرس
میری بقائے زیست کو
معدوم کر سکتا نہیں
جتنی بھی ہوں تنہائیاں
اجڑے نگر، خاموشیاں
زیرِ حصارِ مرگ بھی
چھوڑی نہیں میں نے زمامِ آرزو
بے دست و پا بھی چل پڑوں گا دیکھنا
صبحِ بقا کو ڈھونڈنے
گو راستے مسدود ہیں تو کیا ہوا
زادِ سفر مفقود ہے تو غم نہیں
مجھ سے گریزاں منزلیں ہوں
یہ بھی ممکن نہیں

میں تو ازل کا سر پھرا
میں ہی ترا آشفتہ سر
میری تب و تابِ جواں
میری تگ و تازِ رواں
کے سامنے
ہر اک وبا، ہر اک بلا
سیماب پا
مانا مرض ہے لا دوا
مانا کٹھن ہے معرکہ
کہتا ہے پھر بھی حوصلہ
کھلنے کو ہے بابِ شفا
شامِ فنا بھی بن گئی
میرے لیے
صبحِ طلوعِ زندگی

☆☆☆☆

نصیر بلوچ

کرونا چیز کیا ہے

کرونا چیز کیا ہے؟
ایک بے وقعت ولا وارث حقیر و ناتواں دشمن
تو پھر یہ خوف کی تہمت ہم اپنے پاک دامن پر کبھی لگنے نہیں دیں گے
سمجھنے کی ضرورت ہے مرے اہلِ وطن سمجھو!
عدو اتنا اپاہج ہو کہ اک دو قدم
چلنے کی طاقت بھی نہ رکھتا ہو
تو پھر کیوں اپنے دست و پائی خود بیساکھیاں دے کر
اسے پیوست جاں کر لیں
اصولوں کے منافی ہے
وطن کے باسیوں اور ہم نشینوں سے تمسخر ہے
حماقت ہے نا پوروں کے توسل سے اسے ہم جسم کے اندر
نظامِ زندگی برباد کرنے کی اجازت دیں!
کیوں اپنے ان دھلے ہاتھوں سے چہرے ناک اور مونہہ کو ادائے بے نیازی سے
کریں کھجلی؟
یہی اک لمس ہی تو ہے جو رستہ ہے کرونا کا
بھلا سوچو مناسب ہے؟
اٹھا کر دشمنِ جاں کا لبادہ زیبِ تن کر لیں
یا اپنی ناز پروردہ ہتھیلی پر سجا کر کوچہ و بازار تک لائیں
اب ایسا ہو نہیں سکتا حقیقت کھل گئی اس کی
ہماری قوم اس سے جنگ کا اعلان کرتی ہے

اجل کے خوف کو ہم بے ثمر، بے بار کر دیں گے
کرونا کی سبھی نسلوں کو ہم سنگسار کر دیں گے
اسے زنجیر کر کے قید تنہائی میں رکھیں گے
قرنطینہ میں یا پھر چار دیواری میں رکھیں گے
اگر یہ بد چلن، موذی صفت آزاد ہو جائے!
صف ماتم بچھے اور زندگی برباد ہو جائے!
حماقت ہے اور ہم ایسی حماقت کر نہیں سکتے
غلام مصطفےٰ ہیں اس کے ہاتھوں مر نہیں سکتے

☆☆☆☆

علی رضا بلوچ

روزنِ امید

نجانے کب میں اک ایسے جہاں میں آ گیا تھا کہ
جہاں پر اک عجب لاحاصلی کی کیفیت
طاری تھی دنیا پر
کہ جیسے سامنے منزل کھڑی تھی اور پاؤں شل سے تھے سب کے
ہمت نہ تھی کہ بڑھ کر ہاتھ سے چھو لیں پری پیکر سی اپنی شاہزادی کو
نقوش عشق کے سارے محل مسمار تھے جیسے
تھے بال و پر قفس میں اور بدن آزاد تھا سارا
چراغوں کی لویں بھی جل بجھی سی تھیں
کہ جیسے زندگی ایسے کسی زندان میں تھی کہ جہاں وہم گماں بھی منجمد سے تھے
جہاں بینائی بس دیوار سے دیوار تک کی تھی
جہاں سارے ہنر خاموش اور سہمے سے رہتے تھے
جہاں پر برف کی ٹھنڈک بدن میں شعلے بھرتی تھی
جہاں پر سوچ اور احساس ساکت تھے
جہاں سایہ نکل کر جسم سے کچھ دور بیٹھا تھا
جہاں بازار اور گلیاں بھی سائیں سائیں کرتی تھیں
یوں لگتا تھا کہ یہ آسیب سا ماحول سب کو مار ڈالے گا۔
نجانے کس قسم کا خوف تھا ہر سو
بدن پر کپکپی طاری تھی دھڑکن رک کے چلتی تھی
زباں پر ورد جاری تھا کہ اتنے میں
مری اماں مرا چہرہ پکڑ کر کہہ رہی تھی کیا ہوا بیٹا

بمشکل ہی حلق سے چیخ سی ابھری
تب اماں نے کلیجے سے لگا کر یہ کہا مجھ سے
مرے بیٹے سنو کچھ بھی نہیں ہے ہوش میں آؤ
برا اک خواب تھا جو ٹل گیا ہے
جواباً یہ کہا میں نے
خدا کا شکر ہے جو کچھ بھی دیکھا ہے
وہ سب کچھ خواب تھا اماں
تو کیا یہ خواب تھا اماں؟

☆☆☆☆

ممتاز فاطمہ کاظمی

یقین

میرے وطن کے عزیز لوگو
یقین رکھو کہ
ظلمت شب کا خاتمہ
اب قریب تر ہے
دعا ہماری شدید تر ہے
امید نو ہے یہ
ابر نیساں برس گیا ہے
یقین واثق ہے
رحمتوں کا ہی سلسلہ ہے
غضب پہ حاوی
میرے وطن کے عزیز لوگو
یقین رکھو
میرے وطن کا ہر اک سپاہی
ہر اک مجاہد
ہر اک رضا کار، ڈاکٹر
کے
حسین جذبوں سے
جاں بچانے کی کوششوں سے
وفا کی خوشبو مہک رہی ہے
گلی شفا کی چٹک رہی ہے

وبا کی یہ رت گذر گئی ہے
تمھیں خبر ہے مجھے خبر ہے

یہ ساری دنیا ہی
چشم نرگس کی منتظر ہے

میرے وطن کے عزیز لوگو
یقین رکھو، یقین رکھو

کہ خاتمہ اس وبا کا

دنیا سے ہو رہا ہے
یہ ظلم کی ساعتیں ہیں جتنی
قلیل تر ہیں

سحر یقیناً قریب تر ہے

☆☆☆☆

ادریس بابر

ان دیکھی زنجیر میں جکڑے

ان دیکھی زنجیر میں جکڑے
انہونی کے خوف میں پکڑے
ڈر کے مارے پستے رہے ہم
اس سے کم کیا کر سکتے تھے
جی سکتے ہیں ، مر سکتے تھے
اپنے اندر بستے رہے ہم
ہر کوئی ، اپنی جگہ تنہا
ثابت ہوا! انسان ، کہتا
خود سے مقابلہ کر سکتا ہے
ڈوبتے ڈوبتے تر سکتا ہے

☆☆☆☆

Hasnain Sialvi

محمد حفیظ اللہ بادل

قرنطینہ

میں بہادری میں بھی اپنی مثال آپ ہی تھا
وہ میں تھا
جس نے گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر آدھی دنیا فتح کر لی تھی
بحر ظلمات میں دوڑنے والے گھوڑے بھی میرے تھے
میں دنیا میں کبھی غائب ہو جاتا
اور کبھی ڈھونڈ لیا جاتا تھا
ایک دفعہ مجھے منجنیقیں بناتے ہوئے دیکھا گیا تھا
دریائے نیل پر پڑنے والے عصا میں میری طاقت بھی شامل تھی
دنیا کو تسخیر کر کے چاند پر اولین قدموں کے نشانات بھی میرے تھے
طوفانوں کا رخ موڑنے والا بھی میں ہی تھا
زمین کا سینہ چیرنے میں میرا کوئی ثانی نہیں
خلاؤں کو مسخر کرنا میرے بائیں ہاتھ کا کام تھا
دریا اور صحرا میری ایک ٹھوکر سے دو نیم تھے
میری ہیبت پہاڑ کو رائی کر دیتی تھی
وحشیوں پر جب میرا خوف غالب ہوا تو وہ آبادیوں کو خیر آباد کہہ گئے
میں ایک ہی وقت میں یہاں وہاں تھا
ہیروشیما اور ناگاساکی پر آج بھی میری دہشت طاری ہے
ایک وقت تھا
میری ننگی تلوار کا منقش دستہ مشرق میں ہوتا تھا
جب کہ اس کی لو دیتی انی مغرب میں

دنیا نے دیکھا کہ میں زہر کا پیالہ پیتے ہوئے بھی مطمئن تھا
جس کے نشانات آج بھی میرے دانتوں پر نمایاں ہیں
مگر
آج مجھے کیا ہو گیا ہے
کیا یہ میں ہی ہوں
انسانی آنکھ سے بھی نہ دیکھے جا سکنے والے کے خوف میں مبتلا ہو کر
میں اپنے ہی گھر میں قید ہو گیا ہوں
صبح سویرے
اپنی بالکنی سے ایک معصوم اور بے خوف چڑیا کو
فضا میں اڑتے دیکھ کر
آج مجھے پہلی بار
اس پر رشک آیا
اور اپنے آپ پر حیرت

☆☆☆☆

عمران عامی

مزے کے دن ہیں

گھروں میں بیٹھے ہیں
اور دفتر میں حاضری بھی لگی ہوئی ہے
کسی کا پرچہ بھی کٹ چکا ہے
کسی کی عرضی پڑی ہوئی ہے
فقیر شاہوں کے ساتھ گپیں لگا رہے ہیں
جو ہونے والا نہیں ہے اُن کو بتا رہے ہیں
بتا رہے ہیں کہ بادشاہت "جمہوری مُلکوں" میں بے اثر ہے مُضر نہیں ہے
سب اس پہ تغلیں بجا رہے ہیں
مزے کے دن ہیں
ہر ایک مسجد کے گیٹ پر یہ لکھا ہوا ہے
یہاں حکومت خدا سے ملنے پہ معترض ہے
سو گھر پہ رہیے
خدا کو کمروں میں یاد کیجے
نمازیں پڑھیے اذانیں دیجے
ثواب لیجے
مزے کے دن ہیں
یہاں ضرورت سے کچھ زیادہ ہی رش لگا ہے
قیامت آنے میں چار دن ہیں نجومی والا بتا رہا ہے

نوٹ: مقامی تلفظ "جموری" دانستہ برتا گیا ہے

بتا رہا ہے کہ روغنی نان کھانے والا بھی سوکھی روٹی پہ آ رہا ہے
اور اُس پہ ہنس کر دکھا رہا ہے
مزے کے دن میں
وہ چھت پہ بیٹھی ہے اور میں ٹیرس سے دیکھتا ہوں
وہ ہر منٹ بعد اپنے ہاتھوں کو دیکھتی اور سونگھتی ہے
اُسے کہیں سے پتا چلا ہے کہ سونگھنے اور چکھنے والی حسیں اگر کام کر رہی ہوں
تو سمجھیں کوئی مرض نہیں ہے
وہ اپنے بچوں کو ہاتھ دھونا سکھا رہی ہے
جو خوش نہیں ہیں
وہ اُن کو رونا سکھا رہی ہے
مزے کے دن میں
ابھی ابھی اک حسین لڑکی جو شاپروں سے ڈھکی ہوئی تھی
گزر گئی ہے
محلے والے بتا رہے ہیں اُسے "کرونا" نہیں تھا لیکن
وہ مر گئی ہے
اور اُس پہ کوئی خبر نہیں ہے
مزے کے دن میں
مگر دنوں میں مزا نہیں ہے

☆☆☆☆

عرفان شہود

سات ضرب چوبیس

صورِ اسرافیل نہیں ہے
گونج پڑے
اور شہرِ لوٹ کے انسانوں کے
مُجسمے بے چینی کی غار میں گرتے جائیں

یہ قزاق تو مشترکہ تابوت بنا کر
شمشانوں کے گھاٹ پہ اکثر
طبقاتی حیرت کو ملا کر
اِک معلوم کہانی کے کچھ عکس دکھا کر
سب کانوں میں خوف کا وہ نرسنگھا پھونکیں
جیون بستی لوٹ رہے ہیں

دم کی انگوائی کی چھاتی خشک ہوئی ہے
نوح کی عمر کے خواہش مندوں کی کشتی میں چھید ہوئے ہیں
لمس کے کوڑھ کی ہیبت میں تہذیب کے سائے ماند پڑے ہیں
دشت بگولے قیس کے شہروں میں خود آ کر خاک سروں میں ڈال رہے ہیں
شور کے بوڑھے جادوگر نے ایسا اُلٹا منتر پھونکا
ساری دھرتی مقبوضہ کشمیر کی خاموشی میں گم ہے
چڑیوں کی آواز کہنہ کے مُردہ غار میں کتنے یگوں سے سوئی ہوئی تھی
جاگ گئی ہے

گُھٹتے ہیں
جو اس عالم میں ڈھول بنا کر گلیوں گلیوں بھونک رہے ہیں
کھیل رہے ہیں
دور کسی جنگل کا راجہ
انسانوں کے حال پہ شاداں
چڑیا گھر کو دیکھ رہا ہے
بچھڑے بچے ڈھونڈ رہا ہے

☆☆☆☆

کامران امین

بہار، خوف اور امید کے درمیاں

بہار رُت میں
مرے چمن میں
یہ کیسے موسم اتر رہے ہیں
کہ شاخچوں سے تمام کلیاں
وہ سارے پتے جو شجرِ ہستی سنوارتے تھے
وہ کٹ رہے ہیں
سبھی پہ خوفِ قضا ہے طاری
گلاب چہرے اجڑ رہے ہیں
وہ جن سے ملتے تو ایسے ملتے
کہ روح چاہت بھی جھوم اٹھتی
وہ دور سے اب گزر رہے ہیں
بشر بشر ہی سے ڈر رہے ہیں
کڑا سہی آج وقت لیکن
کبھی رکا ہے نہ اب رکے گا
یہ پھول پھر سے مہک اٹھیں گے
بہار موسم کا راج ہوگا
یہ قافلہ ہے یہ پھر چلے گا
یہ وحشتوں کے مہیب سائے نہیں رہیں گے
یہ شہر، قصبے جو آج اجڑے ہیں
پھر بسیں گے

جو چاند چہرے بجھے بجھے ہیں
یہ مسکرائیں گے کھل اٹھیں گے
امید باقی ہے، آسرا ہے
ابھی تو جگنو کی روشنی ہے
ابھی تو روشن کوئی دیا ہے
پیام دیتا ہے صبح نو کا
ابھی وہ اعلان کر رہا ہے
جہاں میں پھر سے بہار ہوگی
جہاں میں پھر سے بہار ہوگی

☆☆☆☆

ثاقب ندیم

آٹھواں دن ہے

دیواریں ہیں
دیواروں میں خاموشی کے
چھوٹے چھوٹے در کھلتے ہیں
کوئی نہیں ہے.......
میں ہی میں ہوں
کمرے کے ہر کونے میں... میں
دروازے کے سوراخوں سے
اندر جھانکتی آنکھوں میں... میں
یہ دیکھو...... یہ نیچے دیکھو
یہ میں نیچے پڑا ہوا ہوں
اپنے ہی دکھوں کے نیچے
اپنے ہی خوابوں کے نیچے
دس اور دس کا شہر بسائے
چودہ دن کی عمر ہے جس کی
تعبیروں کے کھوج میں کھویا
پڑا ہوا ہوں اور کتابیں
ڈھیر کی صورت گھیرا ڈالے
گھور رہی ہیں سات دنوں سے
پیتا ڈول کی مالا جپتے
تین تال پہ سولہ ماترے پورے کرتے

دس اور دس کے اس کمرے میں

دن بیتا ہے

سینی ٹائزر کہاں پڑا ہے۔۔۔؟

ہاتھوں کو اتنا دھویا ہے

نکھر گئے ہیں

نادانی میں، بے دھیانی میں

آنکھیں ملتے رات ہوئی ہے

آٹھواں دن ہے

ہر اک دن میں سو سو سال

جیا ہے میں نے

لمبی عمروں کا جرمانہ

دو ہفتے کا قارنطینہ

کان لگا کر

دور سے آتی کومل تیری آواز دل پہ

آٹھویں دن میں دھڑک رہا ہوں

☆☆☆☆

فاروق بیگ

کوئی تو آواز میں آواز ملائے

اب تو بہت دن ہو گئے
کوئی تو آواز میں آواز ملائے
چیخے کوئی بہت زور سے
کانوں کے پردے پھٹ جائیں
آسمان کا دل دہل اٹھے
اک ننھے بچے کو دودھ نہیں ملا
اک بڑھیا کو دوا نہیں ملی
شہریوں کو۔۔۔۔تازہ ہوا نہیں ملی

آواز میں کوئی تو آواز ملائے
کوئی چیخے بہت زور سے
چیختا ہی چلا جائے
کہ دم رک جائے
کتنے دن ہو گئے
کوئی فریاد سنتا ہی نہیں
دم گھٹتا بھی نہیں
سانس رکتی بھی نہیں

آواز میں کوئی تو آواز ملائے
میں اک کشمیری ہوں

میں فلسطین میں رہتا ہوں
ہر دم لڑنے کو تیار
قید ہوں کئی سالوں سے
کوئی بولتا نہیں کوئی چیختا نہیں

میرا رب ہی میرا بھروسہ ہے
تم تو خود ڈرے بیٹھے ہو
اک ان دیکھی مخلوق سے

اب تو کوئی آواز میں آواز ملائے
لمن الملک الیوم
للہ الواحد القہار

منزل گم گشتہ
اے ہم سفر دیکھو ذرا
ایک نظر تلاش کی
نشانات منزل ہیں کہاں؟
کھو گیا ہے راستہ
راہی ہیں پریشاں
پیچھے بہت دور ہیں
گھر کے نشاں
ابھی کچھ پتا ہی نہیں
جانا ہے کہاں۔۔۔
کوئی تو بتائے
راستہ۔۔۔منزل کا

سبق ہے بھول گیا
اتالیق ہے کھو گیا
مرشد ہے گم شدہ۔۔۔
بھیڑوں کے گلے پہ
تاک لگائے ہے بھیڑیا۔۔۔
یہ ہے مجھے پتا
پھر بھی ہوں بے خانماں
کھو گیا ہے ناخدا
پتواریں توڑ دیے
منظروں میں کھو کر
راستہ ہوں بھول گیا۔۔۔
اے ہم سفر
ذرا اک نظر۔۔۔ تلاش کی

☆☆☆☆

راحیل احمد

ضرورت

اس وبا کے موسم میں
خوف کی فضاؤں میں
ہر طرف جو پھیلی ہے
ایک بے یقینی سے
اس میں سارے لوگوں کی
سانس چلتی رکھنے کو
مختصر سے عرصے تک
اپنے اپنے کاموں کو
بھولنا ضروری ہے
جان لو کہ اپنی اب
زندگی بچانے کو
زندگی کی گاڑی کو
روکنا ضروری ہے

☆☆☆☆

ڈاکٹر ذوالفقار علی دانش

رباعی

بلا کے دن

لگتا ہے کہ انساں کی سزا کے دن میں
عالم میں "کرونا" کی وبا کے دن میں
دیکھے نہ کبھی زیست نے اس سے پہلے
ہوتے ہی نہیں ختم ، بلا کے دن میں

☆☆☆☆

ناصر محمود ناصرؔ

اندھیری رات بڑھتی جا رہی ہے

اندھیری رات بڑھتی جا رہی ہے
زمیں غم سے سکوتی جا رہی ہے
قیامت ہے، نہیں اس کا سماں ہے
وہی دنیا ہے کیا یہ وہ جہاں ہے
پرندے خوف سے تھرا رہے ہیں
ہزاروں لوگ مرتے جا رہے ہیں
تہِ افلاک لاشوں کے پرے ہیں
چرندے اور پرندے سب ڈرے ہیں
سبھی پر خوف میں غم کی گھڑی ہے
یہاں ہر اک کو اب اپنی پڑی ہے
عوام الناس، تیرے خاص تر بھی
صدائے کن کے سارے منتظر ہیں
لبادے آنسوؤں سے تر بہ تر اور
اسی سپریم تر سے کہہ رہے ہیں
خدائے لم یزل ہم کو بچا لے
کرونا کو زمیں سے اب اٹھا لے

☆☆☆☆

محمد عارف

خاموش مجاہد

سلام تم پہ
کہ تم نے انسانیت کی خاطر
کفن لپیٹا ہوا ہے سر پہ
محاذ پہ ہو
جہاد پہ ہو
مرا ہے ایمان
سب سے برتر ہو
ڈاکٹر ہو

☆☆☆☆

فیصل ریحان

وبائی موت سے انکار

مجھے نہیں مرنا
ہسپتال کے بیمار بستر پہ
وینٹی لیٹرز میں تڑپتے انسانوں کو دیکھتے ہوئے
جب نرسیں اور ڈاکٹرز خوف میں مبتلا ہوں
اور اپنوں سے ملنے پر پابندی ہو
مجھے نہیں مرنا
پلاسٹک بیگ میں ملفوف
رسمیاتِ جنازہ کے بغیر
جب تجہیز و تکفین ملتوی ہو
اور لوگ قبرستان آنے سے روک دیے جائیں
مجھے نہیں مرنا
جنت کی دعاؤں کے بغیر
ایسے بے رحم وقتوں میں
جب گرجوں اور مسجدوں پہ تالے ہوں
اور شہر فاتحہ منسوخ کر دیں

☆☆☆☆

امجد بابر

نئے سفر کا سنگ بنیاد

زندگی
بے بسی کے دائرے میں
صبح کی سرشاری سے بے نیاز
رات کے چراغوں کی نگہبانی میں
آسمانی ستاروں کے جھرمٹ میں قید ہے
پھولوں کی خوش بو
ہوا کے در و بست میں
گم شدہ آسمانوں کا نوحہ بن کر
زمین کے گلی کوچوں میں پھیل گئی
اب پرندوں کی صدائیں
گونگی صدیوں کا منظوم قصہ بن کر اڑتی ہیں

چاروں اطراف
حجات کی تسبیح اور مناجات کی بھاپ سے بھر گئے
عقل حیرت کدے میں گم
نئے راستوں کی جاسوسی کر رہی ہے
شہر میں اذانوں کی حکمرانی ہے
انسانیت اک نئے سفر کا سنگ بنیاد رکھ چکی ہے
یہ کُک ررر وودن ن اا کیا ہے؟
خدا اپنی تخلیق سے مایوس
فرشتوں کے درمیان سلطنت کے تخت پر

بادلوں سے الوادعی خطاب کر رہا ہے
معانی کے تابوت جلا دیے گئے
مقدس عبادت گاہوں کو کس نے بند کروایا؟؟
شاید گھروں کی تنہائی کا احساس
ہمیں جانور سے انسان بنا دے
اس سے پہلے کہ
دیر ہو جائے
اور کرونا ہمارے بیڈ روم میں آ گھسے
اور ہمارے گھروں کو قبرستان تصور کر لیا جائے
☆☆☆☆

فیصل عرفان

خوف

شہر ویران ہے
گاؤں سنسان ہے
آنکھ حیران ہے
دل پریشان ہے
خوفِ انجان سے
ہاتھ کوئی ملانے پہ راضی نہیں
یہ جو لاشیں ہیں
بکھری ہوئی چار سو
کوئی ان کو اٹھانے پہ راضی نہیں
وہ جو رہتے تھے دل کے نہاں خانوں میں
اب وہی پاس آنے پہ راضی نہیں

☆☆☆☆

منصف ہاشمی

ارادھنا

اے خالقِ عصر......اے مالکِ "کن"......!
مسجدوں کے دروازے بند ہیں
مندروں میں ہُو کا عالم ہے
آنسوؤں سے بھیگی صداؤں میں!
قاتل ہواؤں میں......!
بچے گلیوں میں نکلتے نہیں......کرفیو کا نفاذ بھی نہیں
اہلِ زباں......حسنِ بیاں کے پھول کھلتے نہیں
اے خالقِ ارض سماں......!
عنکبوتی تاروں کی طرح وبا کی موجودگی میں......!
اسلوبِ کنعاں میں ڈوبی جوانیاں......!
موجِ زلیخا کی دلفریب روانیاں......!
روایات اذیت سے ڈرتے ہوئے گھروں سے نکلتی نہیں
اے ازل کے مالک......اے ابد کے خالق......!
یہ دنیا تیری ہی بنائی ہوئی ہے، جس کے سر پہ وبا موت بن کے چھائی ہے
نشاطِ روح، سرورِ ازل، وعدہ اول کو یاد کرتے ہوئے......!
شبنمی گلابوں پہ اداسی چھائی ہوئی ہے
کوئلیں، فاختائیں اور عندلیبانِ چمن......!
نہ جانے کن گمنام جزیروں کی طرف نکل گئیں ہیں
اے ربِ دو جہاں...... کچھ بھی معلوم نہیں
رحم فرما......رحم فرما......اے حافظ حفیظ رحم فرما

خوفِ کورونا

یہ آفت کیسی آفت ہے کہ جو تھمتی نہیں ہمدم
یہ آفت کیسی آفت ہے
کہ جس نے گوشۂ تنہائی کو آباد کر ڈالا
محبت کے فسانے کا جہاں برباد کر ڈالا
یہ آفت کیسی آفت ہے
کہ جس میں ہر قدم ہر پل دُہائی ہی دُہائی ہے
اذیت نے سئے آزار کی دنیا بسائی ہے
یہ آفت کیسی آفت ہے
کہ جس نے ہر دوا کو اور ہر دُعا کو بے اثر کر کے
شجر پہ شاخِ گل کو رکھ دیا ہے بے ثمر کر کے
یہ آفت کیسی آفت ہے
کہ جس نے پھول کیا ہر کلی پہ موت لکھ دی ہے
ہماری شاہراہِ زندگی پہ موت لکھ دی ہے
یہ آفت کیسی آفت ہے
کہ جس میں نغمگی کی شہ رگوں میں زہر اُترا ہے
جہانِ صبحِ نو اور رنگوں میں زہر اُترا ہے

(2)

یہ آفت کیسی آفت ہے
کہ جس میں گیت خواب خاکداں ہونے لگے آخر
بدن بیٹھے بٹھائے نیم جاں ہونے لگے آخر

یہ آفت کیسی آفت ہے
کہ جس میں قربتوں سے قربتیں خود فاصلے پر ہیں
رفاقت کے چراغوں سے شبیں خود فاصلے پر ہیں
یہ آفت کیسی آفت ہے
کہ جس میں آہٹوں اور دھڑکنوں پر خوف رکھا ہے
دیارِ دل کی سرحدوں پر خوف رکھا ہے
یہ آفت کیسی آفت ہے
کہ جس میں پھول شاخوں پر اگر قسمت سے کھلتے ہیں
بجائے فصلِ گل کے خشک پتوں سے وہ ملتے ہیں
یہ آفت کیسی آفت ہے
کہ جس میں آنگنوں میں دھوپ کے پاؤں اُتر آئے
دعا تھی جب کہ یہ سب کی یہاں چھاؤں اُتر آئے
یہ آفت کیسی آفت ہے
کہ جس میں آرزوئے دل کی سانسیں ٹوٹ جاتی ہیں
محبت کے ہر اک نغمے کی تانیں ٹوٹ جاتی ہیں
یہ آفت کیسی آفت ہے
کہ جس میں جگنوؤں کی روشنی کے خواب ادھورے ہیں
ستارے، آفتاب و ابر اور مہتاب ادھورے ہیں

(3)

یہ آفت کیسی آفت ہے
کہ جس میں اول و آخر ہمیں رونا ہی رونا ہے
یہ دنیا اب وہ دنیا ہے جہاں "خوفِ کرونا" ہے
یہ آفت کیسی آفت ہے
کہ جس میں سولیوں پر جھولتی ہم سب کی جانیں ہیں
ہماری بستیوں میں اب اذانیں ہی اذانیں ہیں

محمد ابراہیم کھوکھر (انگریزی سے ترجمہ)

تنکوں کی طرح بکھرے ہوئے

تنکوں کی طرح بکھرے ہوئے
ہر ایک کو اپنی منزل کا سفر تھا
پھر اچانک یوں ہم ایک ہوئے
کہ اپنی یک جہتی پر ہمیں فخر تھا

کرونا نے ہمیں جگایا سونے سے
اور اب ہم متحد ہو کر لڑیں گے
ہماری منزل کٹھن اور سفر مشکل ہے
اب ہم سب حق کے ساتھ جڑیں گے

دنیا اب وہ پرانی نہیں رہے گی
زندگی کے نئے سبق سیکھنا پڑیں گے
ہماری ساری مستی، منزلیں رسوا ہو گئیں
نئے دور کے نئے طریقے سیکھنا پڑیں گے

ایک قوم کی طرح متحد ہو کر لڑنا ہے
انسانیت کے دشمن کو ہرانا ہے
ساری احتیاطی تدابیر اختیار کر کے
ہمت سے اس مرض کو گرانا ہے

قدرے دور مگر ہم سب جڑے ہوئے ہیں
اب نئے طریقے سے یہ جنگ جیتیں گے
آن لائن ہوگا کاروبار اور پیار اپنا
دنیا میں امن کے نغمے ہم بکھیریں گے

اس خطرے سے بالکل ڈرنا نہیں ہے
کیونکہ ہم ایک زندہ قوم ہیں
ہمیں کرنا ہے یقین محکم پہ عمل
کیونکہ جیتنے والی پائندہ قوم ہیں

☆☆☆☆

ذوالفقار علی خان (انگریزی سے ترجمہ)

اُمید

آج شاید ایک بڑا دن ہے
لیکن
اگر تم بادلوں کے اُس پار دیکھو
تو تمھیں مل جائیگی
چاندی کی لکیر
اُمید کی کرن

اس میں ہمارے لیے سبق ہے
کہ ہر ایک شکست کے بعد یقیناً فتح ہوتی ہے
ہر ایک غم کے بعد ایک خوشی ہوتی ہے
اور جب تم سوچتے ہو
کہ تم سب کچھ ہار چکے ہو
تو اُمید پھر بھی قائم رہتی ہے

☆☆☆☆

زنیہ شاہ (انگریزی سے ترجمہ)

مشکل اوقات میں

مشکل اوقات میں
جب امید ختم ہو جاتی ہے
اگر موت بسم ہو
اس کا فانی جسم
یا اگر وہ بچ جاتا ہے
یہ مشکل وقت
لیکن تنہا وہ چلتا ہے
کراہنا کو نقصان کے ساتھ

اور کمزوری ہے
ختم نہ ہونے والی معلوم ہو سکتی ہے
اور اس سے لے سکتے ہیں
کچھ نعمتیں بہت زیادہ
جب ایمان دیکھا جاتا ہے
بیچنا اور خریدنا
اور لوٹ مار کا اندھیرا
بہت سارے دل
اور زمین
سنگین افراتفری میں کشمکش
ان مشکل وقتوں سے
جو ہر دن کے ساتھ

سب سے زیادہ میں بدترین
خطرناک طریقے......
"آگے!" لازماً chal نعرہ لگاتا،
غمگین دل۔
"آگے!" ہڑتال کرنا ہوگی
اس کی ٹوٹی باری
اور اگر بادل
پھر بھی خون بہا سکتا ہے
ابی سورج
اس آدمی کو چھونا چاہیے
اور تسمہ اس کی شان ہے
مستی نظموں کے ساتھ:
ایک عقلمند آدمی کا سر
اور ایک مزاج عمدہ

☆☆☆☆

یاور اقبال (انگریزی سے ترجمہ)

جتنے ہیں بھیڑے دنیا کے

جتنے ہیں بھیڑے دنیا کے
وہ تو جانے، بندے تیرے۔۔۔!
ان خشتر تمیدہ سڑکوں پہ۔۔۔۔
بے حرف و زباں حیوانوں کے
دل پژمردہ، لب سوکھے ہیں
اب قہر اٹھا بھی دے ربا!!
"مغرب کے پرندے بھوکے ہیں"

☆☆☆☆

خرم خرام صدیقی (انگریزی سے ترجمہ)

تم تو گھر پہ رکو

گرچہ سورج ہوا ڈرتے ڈرتے طلوع، تم تو گھر پہ رکو
اور پرندے ہوئے نغمہ زن چار سو، تم تو گھر پہ رکو
مادیت کے بے معنیٰ اور بے ہودہ شور سے دور
کارپوریٹ غوغا سے بچو، تم تو گھر پہ رہو
حصولِ وجداں ہے ایک باطنی تجربہ
تری روح ہے راز کی جستجو، تم تو گھر پہ رکو
اگرچہ دلِ غمزدہ کو حسرت رخِ یار کی
عقل کرتی ہے یہ گومگو، تم تو گھر پہ رکو
ڈاکٹر، فوج نرسیں اور پیرامیڈیکل عملہ
لائقِ تحسیں ہے روبرو، تم تو گھر پہ رکو
جو بھی بوتا ہے انساں وہی پائے گا آخرش
شاعروں کو نہ دفتر سے باہر کرو، تم تو گھر پہ رکو
اہلِ ارباب و اہلِ سیاست، وزیروں ججوں
ماسک پہنو، بھیس بدلو ذرا، تم تو گھر پہ رکو

☆☆☆☆

غلام حق سائر (پشتو سے ترجمہ)

کرونا کے حوالے سے نظم

آسان ہے۔ گھر کے اندر بیٹھے رہو اگر کرونا سے بچنا چاہتے ہو۔

یہ موذی مرض ایک سے دوسرے کو لگتا ہے۔ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کو لگتا ہے۔ ایسی بیماری ہے کہ بیماری سے بیماری پھوٹتی ہے۔ اے انسان اس مرض سے دور بھاگو اگر کرونا سے بچنا چاہتے ہو۔

دونوں ہاتھ صابن سے دھونا چاہیے۔ بیس سیکنڈ تک اس کو صابن سے ملنا چاہیے۔ اسی طرح اپنی حفاظت لازمی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ غنی سبحان سے دعا گو ہو اگر کرونا سے بچنا چاہتے ہو۔

ماسک اور دستانے استعمال کرنا بچاؤ کی تدبیر ہے۔ ویسے تو وہی ہوتا ہے جو تقدیر میں لکھا ہوتا ہے۔ اپنے ضمیر کو گواہ بنا کر سوچو اور اٹلی اور چین سے عبرت حاصل کرو اگر کرونا سے بچنا چاہتے ہو۔

بچوں کو گھر کے اندر روکے رکھو۔ ان کو پڑھائی یا کسی اور کام میں مصروف رکھو۔ ہر کسی کو اس بات کی تلقین کرو کہ یہی ہمت ہمیں اس بلا سے چھٹکارا دے گی اگر کرونا سے بچنا چاہتے ہو۔

مکتب، بازار اور مساجد بند ہو گئے۔ ہر ایک امید مکڑی کے تار سے آویزاں ہے۔ ہر زخم منہ کھولے ہوئے بے پیوند ہے۔ پھر روتے رہو گے رونے سے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا اگر کرونا سے بچنا چاہتے ہو۔

بیت اللہ کا طواف بند ہو گیا ہے سوچیں۔ایسا لگتا ہے جیسے ہمارا اللہ ہم سے ناراض ہے۔
اسی لیے ہم اس عذاب میں مبتلا ہو گئے ہیں۔خالق جو کہ رحیم و رحمان ہے سے معافی مانگو
اگر کرونا سے بچنا چاہتے ہو۔

تمام مخلوق کے لیے ساجز کی یہ نصیحت ہے۔ حقیقت اس نے قلم کی نوک پہ لا سجائی ہے۔
اس کی نیت ہر انسان کے لیے آئینے جیسی شفاف ہے۔اے اللہ ہمیں ہر مرض اور وبا
سے بچائے رکھنا دعا مانگو۔اگر کرونا سے بچنا چاہتے ہو۔

☆☆☆☆

فیروز آفریدی (پشتو سے ترجمہ)

بازار ویران سڑکیں سنسان ہیں

بازار ویران، سڑکیں سنسان ہیں
ہر طرف افراتفری ہے
لوگوں کو اپنی جان کی فکر پڑی ہے
قیامت کا منظر ہے
باپ بیٹے سے گریزاں ہے
ماں اپنی لختِ جگر کو چوم نہیں سکتی
شوہر بیوی بچوں کو چھوڑ رہا ہے
اس حال تک انسان خود پہنچا ہے
کیونکہ اس نے فطرت کے خلاف قدم اٹھایا تھا
آج بھی ہم بچ سکتے ہیں
وقت ہے کہ اللہ کی طرف رجوع کریں
اپنی زندگی کو فطرت کے قوانین کے مطابق
گزاردیں

☆☆☆☆

شوکت محمود خٹک (پشتو سے ترجمہ)

کرونا اور امیدِ زیست

کام ہر اک کر دیا مشکل یہاں
کر دیا ویران اس نے کُل جہاں
بادشہ نے بھی کیا جاری بیاں
اپنے اپنے گھر ہی میں محصور ہوں
یوں نہ ہو ، مرحوم ہوں ، مغفور ہوں
آئی ہے ایسی کوئی شے دوستو
شہر ہو کوئی کہ کوئی گاؤں ہو
رو رہا ہے ہر کوئی تقدیر کو
ہاں "کرونا" ہی تو اس کا نام ہے
ہر طرف جو یاں بچھائے دام ہے
اس نے کر دی ہے مری دنیا تبہ
اور کر دی ہے مکدر سب ہوا
ہے یقیناً یہ کوئی کالی بلا
قید ہوں اب کے یہاں گھر میں فقط
شور میں ہے فائدہ ، بالکل غلط
ہو گئے بازار سارے بند یاں
گلشن و گل زار سارے بند یاں
ہو گئے دیدار سارے بند یاں
رات دن دھونے میں اب کے اپنے ہات
ہو رہی ہے اب تو بس یہ احتیاط

مانگتا ہے ہر کوئی اب یہ دعا
دل سے بھی نکلے یہی بس اک صدا
ہو کنارہ کش خدارا یہ بلا
اب نہ پھٹکے جسم و جاں کے پاس یہ
ہو قبول اپنی دعائے خاص یہ
ہے ملک کا تو یہی کامل یقیں
ہر طرف پھیلے گا پھر نورِ مبیں
دور ہو گی یہ بلائے خشمگیں
پھر جہاں آباد ہو گا ، دیکھنا
ہر کوئی یاں شاد ہو گا ، دیکھنا

☆☆☆☆

جاوید خیال (پشتو سے ترجمہ)

خیال نہ پتھروں سے ڈرتا ہے

خیال نہ پتھروں سے ڈرتا ہے
نہ خیال جنگوں سے ڈرتا ہے
بس اے میرے پیارے مالک!
یہ بہار اور یہ خوبصورتی
یہ مستیاں اور یہ موجیں
یہ سبزہ اور یہ سرخ پھول
یہ موسم اور یہ بارشیں
ہر شخص ان کی لیے ترستا ہے
جو کہ سارے ختم ہو رہے ہیں
میں لمبی بخششیں نہیں کرتا
اپنے لیے بھی سوال نہیں کرتا
بس میری یہ آرزو پوری کر
ہمیں اس بلا سے نجات دے
اے خدا! اے خدا! اے ہمارے خدا!
اے اللہ! یہ وبا ختم کر

☆☆☆☆

طیب اللہ خان (پشتو سے ترجمہ)

فطرت کا رنگ

باہر بہار ہے اور انسان سارے گھروں میں بیٹھے ہیں
بڑے آرام سے شور وشر سے دور بیٹھے ہیں
کچھ اپنے شوق سے اور چند مجبور ہو کے بیٹھے ہیں
شکار سے تھکے ہوئے گھروں میں سستا رہے ہے
پرندے خوش ہیں اور امن میں ارام سے ہے

آج موٹروں اور بجلیوں کا وہ دھواں نہیں ہے
بارود خاموش ہے اور جنگ کا ویسا ماحول نہیں ہے
ہوائیں صاف ہو گئیں ہیں اور حبس کا وہ احساس نہیں ہے
بارش نے درختوں، پتوں اور پودوں کو دھو ڈالا اور
پاک اور ہرے چمک رہے ہیں
ریدی اور غاٹول کے پھول بھی دھل گئے ہیں

جس نے سارے ماحول کو جھلسا دیا تھا
وہ آگ خاموش ہے
لاریوں او انجنوں کا بے ہنگم شور خاموش ہے
طاقتوروں کے شوروغوغا کا زور خاموش ہے
جنگ کی دھمکیاں آج ایک دوسرے کو نہیں ڈرا رہی ہیں
سب کو اپنی فکر پڑی ہے جنگوں کے لئے کوئی فارغ نہیں ہے
سارے طبیب آج درد کی دوا ڈھونڈ رہے ہیں

سارے اس وبا کا علاج ڈھونڈنے میں مگن ہیں
لوگ اب انساں کی خیر مانگتے ہیں اور مسیحا ڈھونڈ رہے ہیں
اس وبا کے دوران ہم نے یہ منظر بھی دیکھا
کہ بڑی مدت کے بعد فطرت کو اپنے اصل رنگ میں دیکھ لیا

☆☆☆☆

نادیہ عنبر لودھی (پنجابی سے ترجمہ)

زمین کا نوحہ

زمیں پر خوشی خوشی رہنے والے رہنے کا ڈھنگ بھول بیٹھے ہیں
سب کو اپنی اپنی فکر لگی ہے
زندگی وبا کی زد میں آگئی ہے
مندر، مسجد، گرجا گھر، کعبہ شریف سب بند ہو گئے ہیں
زندگی گزارنے کے تمام قرینے بند ہو گئے ہیں
شاید خدا ناراض ہو چکا ہے
اسی لیے انسان انسان سے چھپ بیٹھا ہے
زمین پر رہتے رہتے انسان بھی تو جینے کا قرینہ بھول گئے تھے
خدا انسان کو خود سے جوڑنا چاہتا ہے
زندگی کا مقصد دوبارہ بتانا چاہتا ہے
خود کو خطرے میں ڈال کے ڈاکٹرز اپنا فرض ادا کر رہے ہیں
حکومت بھی اپنا فرض ادا کر رہی ہے
ہمیں بھی اپنے انسان ہونے کا فریضہ ادا کرنا چاہیے
یہ جہاں ہم سے ہی ہے
قرنطینہ میں رہنا آسان نہیں ہے
اس دھرتی کو قرنطینہ بننے سے بچانا ہوگا
اسے جینے کے لائق بنانا ہوگا

☆☆☆☆

ندیم افضل ندیم (پنجابی سے ترجمہ)

اس دھرتی پہ پہلے بھی وبائیں آئیں

اس دھرتی پہ بسنے والوں کو وباؤں نے بہت تکلیف دی
کبھی ہیضہ خسرہ طاعون اور ایڈز جیسی بیماریاں آئیں کبھی بھی انسان نے ہمت نہیں ہاری
ان بیماریوں سے ہمیشہ لڑا اور آخر کار انسان نے ان پہ قابو پالیا
اب اس کرونا نامی وائرس نے دنیا میں اپنی بہت دہشت پھیلائی ہے
اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں بلکہ جو احتیاط بتائے گئے ہیں وہ کریں
یہ ایک دوسرے انسان کے آپس میں ملنے سے پھیلتی ہے آپ لوگ گھروں میں بیٹھیں
افواجِ پاکستان، پولیس، ڈاکٹرز نرسزا پنے اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں
وبا کے ان دنوں جو بھی ادارہ کام کر رہا ہے میں اُسے سلام پیش کرتا ہوں
ہسپتال کا عملہ بھی تو آخر کسی کی پیاری اولاد ہے
جن مریضوں کو ہم ہاتھ بھی نہیں لگانا چاہتے
وہ انسانیت کی خاطر ان کا علاج کر رہے ہیں
ڈاکٹرز ہمارے پیاروں کی خاطر دن رات اپنے فرائض
ادا کر رہے ہیں تاکہ ہمیں خوشی ہو
ان کی محنت اور علاج سے مریض صحت یاب ہوں گے
اور ہم انھیں پھر کہیں جیتے رہو خوش رہو
دوستو اس وقت آپ حکومت کی طرف سے ملنے والی ہدایات پہ عمل کریں
ندیم افضل کو یقین ہے پھر دیکھنا یہ کرونا وائرس نہیں رہے گا

☆☆☆☆

علی رضا بلوچ (پنجابی سے ترجمہ)

تازہ حقے گڑگڑائیں گے

پھول آج بھی کھلتے ہیں
مگر ان کی خوشبو اپنے چاہنے والوں
کو ترس رہی ہے حسن تعریف کے بغیر گمنام
ہو جاتا ہے کھلے پھولوں کو مشتاق آنکھوں کی ضرورت رہتی ہے
جو انھیں اس عہد پر ساں بھی میسر نہیں
اب بھی گھنی چھاؤں والے تناور درختوں پر شاخیں اور تازہ
کونپلیں اگتی ہیں
اگر اس شفیق و مہرباں چھاؤں کو
اس محرومی کا شدید احساس ہے کہ
اب اسکے سایہ تلے بیٹھنے والے
وبا کے خوف سے گھروں میں مقید ہیں
گاؤں کے داروں اور ڈیروں پہ
تازہ چلم کے حقے کے گرداگرد
اب ان بڑے بوڑھوں اور
وڈیروں کا ہجوم کہیں دکھائی نہیں دیتا
دیہاتوں میں لگنے والے میلے جو ہماری تہذیب
اور ثقافت کے علمبردار تھے اب عارضی بندش کا شکار ہو
گئے ہیں
وہ خوشگوار اور میل ملاپ کے زمانے گزر گئے
یہ محض چند دنوں کا معاملہ ہے

میری آنکھوں کے کسی تہہ خانے میں امیدیں اب بھی زندہ ہیں
جب کوئی پارکھا اور ان مشکلوں کا حل جاننے والا پکارے گا
تو یہ بچھڑے لوگ اور روٹھی بہاریں
کونجوں کے جھنڈوں کی طرح قطار اندر قطار لوٹنا شروع
ہو جائیں گی
اگر سورج طلوع ہوتا ہے تو پھر دیکھ لینا
ان بہاروں کو میرے بھولے بسرے گھر کی یاد ضرور آئے گی
اور از سرِ نو یہ میلے لگنے شروع ہو جائیں گے
اور حقے تازہ گڑگڑانے لگیں گے

☆☆☆☆

ایوب کموکا (پنجابی سے ترجمہ)

اے کرونا! تم نہیں ہماری واقف

ہم تو وہ ہیں جو کالی راتوں پہ درد پھونکیں
تو ان سے سورج نکال لائیں
ہم تو وہ ہیں جو راہ پہ کھینچی لکیر دیکھیں
تو جان جائیں
کہ ان پھولوں کی نسل کیا ہے، کہاں کے باسی
ہم تو وہ ہیں جو نفرتوں کے تندور سے بھی
وفا کی روٹی نکال لائیں
جو اپنے غم کو جلا کے رکھ دیں
اور ہم تو وہ ہیں جو کبھی زمانوں کی پیاس لے کر
نہ بھیک مانگیں سمندروں سے
کرونا تم تو نئی نئی ہو
تم نہیں ہو ہماری واقف
ہم نے وہ بھی عذاب دیکھے جو سورج ٹہنی پہ اگی شاخوں کو کھا گئے تھے
ہم نے وہ بھی عذاب دیکھے کہ حرف سارے ہی مر گئے تھے
اور ان حرفوں کے مردہ جسموں سے
کتنے کانٹے ہی جی اٹھے تھے
یہ تیرا وہم و گمان ہو گا
کہ تیرے ڈر سے
ہم اپنا جیون بھلا ہی دیں گے اور اپنی خوشیاں گنوا ہی دیں گے
یہ چار دن ہیں جو مشکلوں کے ہمارے سر پہ

یہ چار دن بھی گزار لیں گے ہنسی خوشی سے
تم بھی اتنا یہ جان لینا کہ پاک دھرتی کے لوگ کیسے
اندھیری راتوں کو اپنی آنکھیں ہی دان کر کے
یہ کتنے سورج نکالتے ہیں
اور ان اندھیروں کو مارتے ہیں
ہم نے اماوس کی راتوں میں خون سے چراغ روشن کیے
اور سورج کو سامنے لاتے ہیں

☆☆☆☆

ادل سومرو/ممتاز بخاری (سندھی سے ترجمہ)

دھرتی ماں نہ تھی اتنی عمر رسیدہ

جیسے دیس میں ساری آنکھوں کے سامنے
ہر دکھی انسان لگتا ہے اپنا سا
ہے یہ اندر کی بات کیا کریں
سندھ میں لیکن سانسیں ہیں اٹکی ہوئی
بانہوں میں تھی جو بھری ہوئی زندگی
دور سے مسکرانے سے بجھی بجھی

خاموش ہے مکہ بھی مدینہ بھی
شہر میں نہیں بچ رہا احرام کوئی
حرم کی حیرانگی دیکھی عربوں نے
دھرم کے دھاگے سب گئے ڈھل
پرتھوی کے ہوئے خدا سب ظاہر
کل جو گایا تھا بگی نے گیت
تہران میں وہ آنسوں نے سنا
راہ میں کرتے ہوئے عینک صاف بوڑھوں نے سنا
شہر سارے کربلا نما ہوئے
یاد آئی چین کی وہ مہ جبیں
جس نے گھمایا تھا بہشتی مندر
دوزخی لوگوں کا ہوا کیا آخر؟!
میں نے ہے دیکھی موراویا! وڈیو

روم کی راتیں نہیں اب رقص میں
عکس میں ہیں وہی ویرانیاں
شہر لگا تھا تمھارا چہرے بنا
کلیسا کا گھنٹا بجا نہیں اب کوئی
زندگی کا گیت اب گاتا نہیں کوئی
میڈرڈ میں موت کی گاڑی کے اندر
مرگ کے خوف والی چلتی رہتی ہے دھن
وائلن سے بجتی ہیں صرف سکیاں
پریشاں ہیں دھنیں موزارٹ کی!
کون ہے جواب بھی اسپین میں
ڈھونڈتی ہے لاش لورکا کی!
جولیٹ! تمھارا شہر ویرونا
اور روما کا قافیہ تھیں ایک جیسے
کون نگل گیا تمام رونقیں
عشق ہی روک سکتا ہے یہ آفتیں
رقص رومی کا بھی ہے ملتوی
قونیہ کا کرب سوئی! سمجھو تم
تبسم تمھارا کس نے چھینا ہے مشہدی!
دیکھو کس طرح ہے لڑ رہی زندگی موت سے

رات بیجنگ کی اب تک سوئی نہیں
راگ بجنائی کا جاری ہے مسلسل
سادھا بیلے میں دیکھ اب بھی پڑھ رہی ہے
شیخ کی شاعری وہ سکھر کی پدمنی

ماں کے چہرے میں ہے کوئی سورج

کی ہے جس نے مہرباں چھاؤں بچے پہ

ہوگی شکست اس رات کو آخر

فارسی فانوس میں ہے روشنی

کھلے گی کوئی کھڑکی آزادی کی

آئے گا اچھا وقت دینس کا پھر سے

اپسرائیں آئیں گی پھر اس طرح

اور ہوں گے میلے میلان میں پھر سے

☆☆☆☆

خالد چانڈیو (سندھی سے ترجمہ)

شہری بھی تنہا ہے ، گاؤں والا بھی تنہا ہے
آفت کا سماں دیکھو ، کعبہ بھی تنہا ہے
انساں سے انساں کا ملنا بھی نہیں دیکھو
تنہا ہے بغل گیری ، بوسہ بھی تنہا ہے
قربت کو رہنے دیں، کچھ دور سے بات کریں
موجودہ حیاتی کا لمحہ بھی تنہا ہے
کوئی بھی نہ جان سکا، تنہائی میں کیا بیتی
دکھ درد بھی تنہا ہے ، رونا بھی تنہا ہے
روزانہ نئی باتیں ، روزانہ نئے احکام
دلداری بھی تنہا ہے ، چھتا بھی تنہا ہے
سامان تباہی کا کس ہاتھ نے پھیلایا
دنیا کا مکمل یہ نقشہ بھی تنہا ہے
مشکل کا سماں لیکن ، آیا ہے گزرنے کو
خالد بھی تنہا ہے ، کمرہ بھی تنہا ہے

☆☆☆☆

ایاز گل (سندھی سے ترجمہ)

زندگی لوٹ آئے گی

یہ ذرہ جو دنیا پہ اترا ہے
اسے سہنا پڑے گا
لیکن اس سے ڈرنا اور ہارنا
زندگی کے لیے ایک طعنے کی مانند ہوگا

مشکلات باہمت انسانوں کے لیے ہی ہوتی ہیں
میرا رب، بہت بڑا ہے، اسی کے سہارے
تمام مشکلات کا سامنا کرنا ہے

دوستو! یہ وبا کا موسم ہے
اس بات کو دھیان میں رکھنا ہے
گھر میں رہ کر، اپنے آپ اور سب اپنوں کو اس سوتمار وبا سے بچانا ہے

''کورونا'' سے ہاتھوں کو صاف رکھ کر ہی بچا جا سکتا ہے اور اس طرح اُسے
گھر کی دہلیز سے ہی دور بھگانا ہے

گلے لگنے اور گھل کے ملنے کے دن
جلد لوٹ آئیں گے
اور گلی گلی رونق میلے لگیں گے
بس حسین زندگی کے یہ خوبصورت رنگ اڑنے نہیں دینے اور نہ ہی
اپنے گھر کے روشن دیئے بجھنے دینے ہیں

امر اقبال (سندھی سے ترجمہ)

کورونا

اس وبا کے موسم میں
اتنا ہی پوچھا ہوتا
کہ تمہارا دن کس طرح گزر رہا ہے؟
شام کے وقت کیا کرتے ہو؟
آج کون سی فلم دیکھی؟
اور کون سی کتاب پڑھی؟
بس اتنا کچھ ہی کہتیں!!
دودھ یا سگریٹ لینے روڈ تک جاؤ تو ماسک پہن کر جانا
یہ کورونا تو ختم ہو ہی جائے گا
پر تمہاری بے رخی کبھی ختم نہیں ہوگی......!!

☆☆☆☆

شہباز تبسم (سرائیکی سے ترجمہ)

ایک نظم

سب لوگ کرونا سے حیران اور پریشان نظر آرہے ہیں
جن میں طاقت تھی وہ بے زور ہو گئے
سبھی کے نقصان نظر آرہے ہیں
بیٹ یعنی کچے علاقہ ہو، روہ تھل ہو یا ڈیرہ غازی خان ملتان ہو
سب جگہیں ویران نظر آرہی ہیں
مولا ہم پر رحم فرما اس مصیبت کو ٹال اور خیر عطا فرما
اس مصیبت سے سب بہت مشکل میں نظر آرہے ہیں
اس حالت میں گھر پر ہی رہنا ٹھیک ہے
کیونکہ اپنوں سے بھی یہ لگ سکتی ہے اپنا جسم بھی اب بے ایمان نظر آرہا ہے

☆☆☆☆

راحل بخاری (سرائیکی سے ترجمہ)

نصیحت

آنکھ کے جھلارے میں
کتنے رنگ ہیں
اگر دھول اڑی تو؟

خواب زاروں میں
بہار کا جوبن ہے
اگر موسم بدلا تو؟

دل کے صحن کا
قدیم برگد
کٹ گرا تو؟

زندگی کی کلائی میں
سانس کی چوڑی ہے
یہ چوڑی ٹوٹ گئی تو؟

دفن ہو کر جدا ہونے سے بہتر ہے
کچھ پل اپنے نام کے جوڑیں
اپنے ساتھ کا رشتہ نہ توڑیں

☆☆☆☆

بشریٰ فرخ (ہندکو سے ترجمہ)

اگر کرونا سے چاہیں نجات کی صورت
نہ جانے ہاتھ سے دیں احتیاط کی صورت
وہ دل کبھی نہیں گھبراتے آزمائش سے
"امیدِ زیست" جہاں ہے ثبات کی صورت
چراغِ عزم کسی موڑ پہ بجھا نہ سکے
اندھیرے جب بھی ملے کالی رات کی صورت
سپاہی ، فوجی ، رضاکار ، ڈاکٹر سب ہی
کھڑے ہیں سامنے یومِ نجات کی صورت
جو خود کو بھول گئے خلقتِ خدا کے لیے
تو خلق کو وہ فرشتے ہیں ذات کی صورت
جو بانٹ لیتے ہیں مل جل کے سارے درد تو پھر
بدل سی جاتی ہے اس کائنات کی صورت
نبھانے والے فرائض کو عزم و ہمت سے
رہیں گے دل میں سدا شش جہات کی صورت
جو جان دے کے ہوئے سرخرو زمانے میں
ہے ان کا ذکر لبوں پہ قرات کی صورت
سلام کرتے ہیں بشریٰ ہم ان کی عظمت کو
نمو میں جن کی ہے اعلیٰ صفات کی صورت

☆☆☆☆

رحمت عزیز چترالی/شفیق الرحمٰن چترالی (چترالی سے ترجمہ)

ایک نظم

کرونا جیسے مہلک وبائی مرض کو میں اچھی طرح شکست دوں گا، اپنے آپ اور دیگر
لوگوں کو اس مرض سے بچانے کے لیے نہ میں کسی سے ہاتھ ملاؤں گا اور نہ کسی سے گلے
ملوں گا

مجھے کھانسی آئے یا چھینک آئے تو کھانستے اور چھینکتے وقت احتیاطی تدابیر کے طور پر میں
اپنے منہ اور ناک پر ہاتھ، رومال اور ٹشو پیپر رکھوں گا

اس موذی اور مہلک بیماری کے بارے میں بھرپور عوامی آگاہی مہم چلا کر عوام میں شعور
بیدار کرنے پر میں حکومت پاکستان کو تخلیقی ذہن والی ریاست کا نام دے رہا ہوں

کورونا کی وجہ سے لاک ڈاؤن ہونے پر جن جن لوگوں کے گھروں میں راشن ختم ہو گیا
ہے میں خود کم کھاؤں گا بلکہ ان کو پہلے راشن فراہم کروں گا

جو بچے اس بیماری سے نکلنے کے لیے بار بار اپنے ہاتھ دھو رہے ہیں ان کے لیے سمندر
سے چن چن کر خوبصورت سیپیاں بطور تحفہ لاؤں گا
ڈاکٹر، نرس اور اکادمی ادبیات پاکستان کرونا سے بچاؤ کے لیے جو خدمات انجام دے
رہے ہیں ان کو میں اپنی طرف سے نرگست کے پھولوں کا دستہ پیش کروں گا

جو لوگ گلے ملنے کیے لیے میرے قریب آئیں ان کو احترام کے ساتھ منع کر کے ہاتھ
ملانے کی بجائے ہاتھ سینے میں رکھ کر بطور تعظیم اپنا سر خم کروں گا

پاک فوج اور پولیس کی کرونا وائرس کو شکست دینے کے سلسلے میں خدمات کے لیے
رحمت عزیز ان کو سیلوٹ پیش کرتا ہے اور جب یہ مہلک بیماری پاکستان سے ختم ہو گی تو
میں پرتپاک انداز میں اپنے ان سپاہیوں سے ہاتھ بھی ملاوں گا

☆☆☆☆

پروفیسر حشمت علی کمالؔ الہامی (بلتی سے ترجمہ)

۱

اس وقت پوری دنیا میں کرونا وائرس کا چرچا ہے۔ اے دوستو! اذلاً ہرگز ہرگز اپنے گھروں سے باہر نہ نکلنا! بالفرض مجبوراً کہیں نکلنا تو از حد احتیاط سے نکلنا

۲

ڈاکٹر حضرات فرماتے ہیں کہ اس وبائی بیماری کا اب تک کوئی علاج نہیں، بس اُن کا مشورہ یہی ہے کہ اس کا واحد علاج، سماجی فاصلہ اور گھروں میں کورنٹائن کے ساتھ رہنا ہے

۳

اس خطرناک بیماری سے بچنے کے لیے از حد احتیاط، سوچ بچار اور حوصلوں کو بلند رکھنے کی ضرورت ہے، ساتھ ساتھ اُس خالق و مالک پر یقین اور بھروسا رکھنا چاہیے

۴

احتیاطی تدابیر کے طور پر ایک دوسرے سے ہاتھ ملانے اور معانقہ کرنے سے مکمل گریز کرتے ہوئے منہ ہاتھ بار بار دھوتے ہُوئے، جسمانی مدافعتی نظام کو قوی اور مضبوط رکھنے کی ضرورت ہے

۵

یہ بڑی خوش آیند بات ہے کہ جب اہلِ وطن مشکلوں سے دوچار ہیں ایسے میں دریادل سخی لوگ اُن کی بھرپور مدد کر رہے ہیں

۶

اس سخت وبائی بیماری کا خاتمہ کرنے کے لیے جو لوگ انتظامات اور منصوبہ بندی کر رہے ہیں اُن سب کی خدمت میں ہم سلام عقیدت پیش کرتے ہیں۔ ڈاکٹروں اور دیگر رضا کاروں اور مددگاروں کے ہم بے حد احسان مند ہیں کیوں کہ اُن کے دلوں میں وبائی مریضوں کا درد ہے

۷

اے بھائیو! ماؤ بہنو! اور وطن کے باسیو! غم نہ کرو! دکھ درد کے یہ دن جلدی گزر جائیں گے اور بہت جلد خوشیوں کی سحر آنے والی ہے

۸

اپنے جسم و جاں، گھروں، شہروں اور وطن کی حفاظت کرنا ہم سب پر لازم و واجب ہے۔ بڑے آرام سے ہمیں اپنے گھروں میں بیٹھنا چاہیے۔ باہر نکلنا خطرے سے خالی نہیں

۹

حفاظتی تدابیر کے حوالے سے حکومتی ارکان اور رہنماؤں کے فرامین پہ کان دھرنے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں بزرگوں اور علماء و فضلا کی فرمان برداری کرنی چاہیے

۱۰

اے دوستو! آپ سب کی خدمت میں کمال کی یہ اہم ترین گزارش اور درخواست ہے براہ کرم ٹولی ٹولی کی شکل میں خواہ مخواہ ہر جگہ گھومتے نہ پھریں!

☆☆☆☆

ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد یکم جنوری ۱۹۷۰ء کو ڈومیال تحصیل پنڈی گھیب ضلع اٹک میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ کالج، اٹک سے گریجویشن کرنے کے بعد جامعہ پنجاب، لاہور سے ایم اے اُردو (درجۂ اوّل) کی ڈگری حاصل کی۔ بعد ازاں اسی جامعہ سے ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کی نگرانی میں: ''اُردو غزل کا تکنیکی، ہیئتی اور عروضی سفر'' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۹۷ء میں پنجاب پبلک سروس کمیشن کے امتحان میں کامیاب ہوئے اور گورنمنٹ کامرس کالج، اٹک سے بحیثیت استاد وابستہ ہوئے۔ ۲۰۰۷ء سے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد کے شعبۂ اُردو سے منسلک ہیں۔ ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد تدریس کے ساتھ ساتھ تحقیق، تدوین اور شاعری کے میدانوں میں بھی سرگرم عمل رہے۔ ان کی تصنیفات و تالیفات کی تعداد تین درجن کے لگ بھگ ہے۔ سات سے زائد تحقیقی اور تنقیدی مضامین معروف رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ پی ایچ ڈی کے پندرہ اور ایم فل کے تیس سے زیادہ اسکالرز نے اپنا تحقیقی کام آپ کی زیر نگرانی مکمل کیا۔ ان کی علمی و ادبی خدمات پر کئی اداروں اور تنظیموں نے انھیں انعامات اور اعزازات سے نوازا اور مختلف جامعات میں ان کی علمی، ادبی اور تحقیقی کارگزاری، تحقیقی ایم اے اور ایم فل کے مقالات کا موضوع بنی۔

PAKISTAN ACADEMY OF LETTERS

Patras Bukhari Road, H-8/1
Islamabad, Pakistan
Phone: +92-51-9269721, 9269714
Website: www.pal.gov.pk -email: adabiyaat@pal.gov.pk